

شاردا پیٹھ

تاریخ کے آئینے میں

راجہ نذر بونیاری

شارداپیٹھ

تاریخ کے آئینے میں

(سفرنامہ)

راجہ نذر بونیاری

Shankracharya's seat. We are struggling for re-opening of Sharda Pilgrimage in PoK that was last held in 1948 by our Guru Swami Nand Lal ji - a Kashmiri Saint. We have LoC permit in force for travel across LoC that is meant for J&K residents. This LoC permit was formulated by MEA after Vajpayee-Musharaf summit and is in force since 2007. We have taken up the matter with GOI for bringing an amendment in LoC permit rules by adding annual pilgrimage to Sharda Peeth on the lines of sikhs pilgrimage to Nankana sahib in Lahore that is held annually and now the Kartarpur yatra. We at Save Sharda Committe are pressing for cross LoC Heritage & Religious tourism that should bring people closer. People of PoK

FOREWORD

This book "Sharda - Tareekh Ke Aaine Mein" is a bold attempt to gather the travel & subsequent observation by a native divided because of LoC. Raja Nazar Buniyari, a native of Buniyar village on Baramulla - Uri Road is fascinated by Sharda subject and nobody knows the subject better than him. Having said so, the travelogue created by him and a peep into the past of the most revered Hindu site deserves kudos.

Sharda - the basic seat of learning for Hindus is the oldest civilization and was once the part of Sharda desh and also Adi

should also be allowed pilgrimage to our part of Kashmir in J&K state. Recently we had written and hailed judgement on Katas Raj temple in Punjab by SC of Pakistan and we have written to SC of AJK as well for passing a similar judgement on Sharda Peeth too. We have got a positive reply from SC of AJK in this regard. The landmark judgement has been received by the Head of the Committee in New Delhi in Januar'2018. We have raised a civil society of about 150 members across loC in PoK that is working in tandem with us. Prominent persons include Rayees Mohammad (a Forestor), Tanveer Ahmad (British passport holder), Khwaja Farooq, Haji Shabbir (Nizamuddin Aulya group), Kh. Nazir

(Ex-conservator of Forests), Khawaja Ab. Ghani (Author), Adv. Iftikhar Anjum (Researcher), Ms Sadiyah Rehman (activist) amongst others. Now that for the first time since partition flowers have been laid by civil society of POK in Nov 2016 and later in March last year photograph of Sharda Devi was installed inside temple - first time in the last 72 years. An order by DG Archeology & Tourism PoK Govt. in favour of Save Sharda committee for maintaining sanctity of the Peeth in Dec 2018 has added to the depth of the mission. Nearly 37 minorities shrines in 10 districts of PoK have also been brought under the aegis of Deptt of Archeology there vide Order dated 29.06.2019. The visit of Dr. Ramesh Vankwani with a delegation of 5

Pakistani Hindu Council members on 24 June 2019 to Sharda peeth was also historical & in consultations with Save Sharda committee. But Pakistani Govt. upon submission of report by Dr. Vankwani took a decision to allow only Pakistani Hindus to visit Sharda Peeth. Then in a coordinated move Save Sharda Committee sent a Hong kong based couple Venkataraman and Sujata, who performed Puja near Sharda in Village Pateeka on the banks of river kishenganga on 4th Oct. 2019. It was the first ever puja since 1948 in Sharda Land. A large section of the civil society in PoK have expressed their desire and support our cause. As per LoC permit rules only relatives living across LoC are allowed to travel on

special occasions via Uri - Muzaffarabad and Poonch - Rawalkote routes. Thus a common J&K resident feels discriminated as those who do not have relatives living on either side of LoC cannot go to either side. This deprived section not includes J&K Hindus alone, but Muslims, Sikhs, Buddhists and others as well. LoC trade is also going on through these specified routes, presently suspended though. All Shankracharya followers are keen for restoration of Sharda peeth to its pristine glory. The recent opening of Kartarpur corridor has added a new dimension to the issue & rekindled hopes for early reopening of Sharda Peeth. The Head of Save sharda committee visited Kartarpur Sahib in Pakistan on 24th

November 2019 and presented a memorandum to the Sikh Prabandhak Committee for reopening of Sharda on similar lines. Prime Minister Mr. Modi has time & again emphasised for People to People contact for such issues. Nowhwere, in the world has any major religious site been closed in any conflict zone as Sharda. Prayers in Al Aqsa Mosque in Jerusalam or Dura europos Church in Syria have never stopped for a day. Q. No: 1128 on 20 Dec 2018 in Rajya Sabha on Sharda reopening is on record. The treaty between two nations can be reviewed and annual pilgrimages initially on LoC permit for J&K residents and an addendum be made to the present rules for cross LoC religious & Heritage tourism.

Later devotees from all over the country can undertake this pilgrimage. This can be viewed as biggest CBM too.

We as natives of the region sincerely believe that more such writers will come forward on both sides of LoC to explore the Sharda civilization and inquest is carried forward to the gen Next.

Regards,

Ravinder Pandita,
Head / Founder
Save Sharda Committee
Kashmir (Regd.)
Tel : 9811143024

Panditaravinder8@gmail.com

عرضِ مصنف

.... بظاہر اس کتاب کے لئے عرضِ مصنف نام کی کسی تحریر کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن اس کا عنوان پڑھ کر اس کی اہمیت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ''شاردا'' اتہاس کے پنوں میں تو موجود ہے...... لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ ''پنے'' مختلف زبانوں سے تعلق رکھنے والی کتابوں کے ہیں۔ ان میں اُردو کی صرف چند ایک کتب ہیں جو پاکستان کے ادبا نے تحریر کی ہیں۔ یہی چند کتب ہماری نظروں سے گزری ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے بعد کچھ اور کتابیں معرض وجود میں آئی ہوں لیکن کیا یہ سچ نہیں ہے کہ پاکستان اور پاکستان کے زیرِ انتظام کشمیر کی سرکاری اور نجی لائبریریوں تک ہی محدود ہوں اور اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابیں محدود قارئین کی نظروں سے ہی گزرتی ہوں۔ میں ان مصنفین کا شکر گزار ہوں جن کی تصنیفات سے میں مستفید ہوا ہوں۔ میں گزیٹیر آف کشمیر کے مصنف کا ذکر کرنا بھول گیا تھا۔ اس کتاب کا حوالہ میری تحقیق میں موجود ہے۔

میں نے جب یہ کتاب مکمل کی تو میرا رابطہ ''شاردا پیٹھ'' راہداری کھولنے کی کوششوں میں مصروف ایک کشمیری پنڈت دانشور رویندر پنڈتا سے ہوگیا...... رویندر پنڈتا کا مشن ایک سنجیدہ کاوش ہے۔ انہوں نے میرے سفر نامے کی روشنی میں ''راہداری'' جیسے موضوع پر کچھ نہ کچھ سوالات بھی پوچھے اور اپنی ٹیم کے ہمراہ بونیار بھی تشرف لائے۔ رویندر پنڈتا اپنے مشن میں کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ حکومت پاکستان اور سپریم کورٹ آف ''آزاد کشمیر'' نے اس حوالے آن کی درخواستوں پر جو سفارشات جاری کی ہیں وہ بھی اس کتاب کے آخری صفحات میں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آنے والے وقتوں میں کبھی نہ کبھی یہ ''راہداری'' کھول دی جائے۔ لیکن ''راہداری'' سے زیادہ اہم ''شاردا'' پر لکھا گیا وہ لٹریچر ہوگا جو صدی یا اس سے پہلے لکھا گیا ہو...... بظاہر اس کی کوئی امید نہیں لیکن اس پر تحقیق کی زبردست گنجائش موجود ہے۔ اس سلسلے میں سفر ناموں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ راقم الحروف کے زیرِ نظر سفر نامے کی کوئی خاص اہمیت نہیں...... لیکن وادیٔ نیلم کی تاریخ اور جغرافیہ کے انتہائی اہم اوراق اس میں زندہ ہوجاتے ہیں۔ اور اگر سیاست نہ کی جائے تو ان اوراق کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ قلمروئے جموں و کشمیر، لداخ، گلگت، بلتستان اور شمالی علاقہ جات کے خواندہ بھائیوں بہنوں کے لئے دنیا بھر کے دوسرے ممالک کے سفر نامے جو معروف سفار نے تحریر کئے ہیں اتنی اہمیت نہیں جتنی کہ اپنی قلمرو میں لکھے گئے سفر ناموں کی ہے۔ کیونکہ عام ناخواندگی کی وجہ سے ہمارے عوام الناس اپنے ''ملک'' میں تحریر کئے گئے مشہور سفار کے سفر ناموں اور ان کی آرا سے ناآشنا اور بے خبر ہیں۔ صرف چند تعلیمی

اداروں کی درسی کتب میں کہیں نہ کہیں اُن کا ذکر ملتا ہے۔اس کی تفصیلات ڈاکٹر انور سدید نے اپنی تحقیقی کتاب ''اردو ادب میں سفرنامے'' سے ملتی ہیں۔

ہماری قلمرو پر جن دانشوروں نے اپنے سفرناموں میں اپنی آرا کا اظہار فرمایا ہے۔اُن میں مارکو پولو، ہیون سانگ، ابن بطوطہ اور معلوم دور میں مشہور محققین اور مؤرخین جن کا تعلق یورپ سے رہا ہے جو بل قدر ہیں۔انہوں نے اپنے سفرناموں میں نہ صرف وادی کی قدیم تاریخ رقم کی ہے بلکہ اس قلمرو کے دشوار گزار اور دُور اُفتادہ عدم رسائی والے علاقوں کی تاریخ و جغرافیہ کو بھی رقم کیا ہے۔جنہیں پڑھ کر ہماری معلومات میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے...... زیر بحث کتاب میں ان کا ذکر ضروری نہیں کیونکہ ہمارا اصل موضوع شاردا پیٹھ ہے۔جس کے بارے میں ہمارے مؤرخین اور محققین نے اپنے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔بہرحال تحقیق ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔پاکستان کے جن محققین، مؤرخین اور ادبا نے اس موضوع پر جو کتب تحریر کی ہیں، وہ سفرنامے نہیں مگر سفرناموں کا ذکر اور تحقیق اُن میں موجود ہے۔ان میں خواجہ عبدالغنی، رشید فاروقی شامل ہیں۔اپنی کتاب میں راقم نے ہر مقام پر ان کی تصانیف کے حوالے دیئے ہیں۔میں ان کا شکرگزار ہوں کیونکہ میں معترف ہوں کہ میں نے ان کی تحقیقی کتب سے استفادہ کیا ہے۔خصوصاً وادیٔ نیلم اور اس کے ملحقہ علاقوں کے بارے میں بہت کچھ پڑھنے کو ملا۔راقم نے خود بھی وادیٔ نیلم کے اکثر علاقوں کی سیر کی ہے۔بہرکیف جو کچھ

دیکھا، سننے کو ملا اور پڑھا وہ سب کچھ اس کتاب میں درج کر لیا۔

کتاب کی ترتیب و تدوین، کمپوزنگ اور تزئین کاری میں جن دوستوں نے میری مدد کی، میں ان کا شکرگزار ہوں اُن میں خالق پرویز اور اطہر بشیر شامل ہیں۔کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کا کام دو مرتبہ انجام پایا۔

خلوص کیش

راجہ نذر بونیاری

مورخہ یکم نومبر 2020ء

شاردا پیٹھ
(ماضی کے دریچوں سے)

قلمروئے جموں وکشمیر ولداخ، تبت وگلگت بلتستان وشمالی علاقہ جات کی قدیم تواریخ، تذکروں اور سفر ناموں کو پڑھنے کے بعد ایڈونچر ٹورازم اور اس خطے کی گم گشتہ اور بھولی بسری تہذیب وثقافت اور تاریخ کی بازیافت کا شوق میرے اندر جنون کی حدوں تک چھونے لگا تو میں نے فیصلہ کرلیا کہ اپنی سیاحت و سفارت کا آغاز 'شاردا پیٹھ' سے کیا جائے، جو گزشتہ پون صدی سے ایل،او،سی کے اس طرف رہنے والوں کے لئے ایک بھولی بسری داستان کا عنوان بن گئی ہے۔ اکثر لوگ اس نام سے ہنوز نا آشنا ہیں۔

ایک مرتبہ (آج سے تقریباً چالیس سال پہلے ایک دوست نے مجھے ایک مورتی لاکر دی، جو اُس کو بونیار کے تاریخی ماخذ (مندر) کے پاس پڑی ہوئی ملی تھی۔ اُس مورتی کا سر غائب تھا، لیکن چھاتی سے لے کر پاؤں تک اُسے دیکھ تو

مجھے یہ مہاتما بُدھ کی مورتی لگی۔ میں نے اُسے بونیار مندر کے پنڈت (پروہت) روہت ترپاٹھی کو دکھایا تو اُس نے صرف اتنا کہا "پراچین کال کی ہے!"........ "کہاں سے لائی ہے؟"

میں نے کہا یہ اِسی مندر کے باہر کی دیوار کے ساتھ پڑی تھی۔ پنڈت کے کان کھڑے ہوگئے۔ "ہیں! یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ یہ تو گوتم بُدھ کی لگتی ہے۔ یہاں کیسے"؟ مجھے یاد آ گیا کشمیر انسائیکلو پیڈیا میں دوسرے منادر کے ساتھ ساتھ بونیار مندر کو معروف شاعر، ادیب اور ریسرچ اسکالر موتی لال ساقی نے ہندو (پانڈو) مندر لکھا ہے۔

بہر حال میرے اس نظریے کو اس واقعے سے تقویت ملی کہ یہ مندر بُدھ پرچارکوں نے تعمیر کیا ہے۔ اور سیاح اور مورّخ ہیون سانگ نے بھی اپنے سفر نامے میں اِس کے بودھ مندر ہونے کا اشارہ دیا ہے۔

سری نگر کے ایس، پی، ایس میوزیم میں 'شاردا پیٹھ' سے لائے گئے کچھ کتبے اور ٹوٹی پھوٹی مورتیوں کے ٹکڑے دیکھنے کو ملے نیز اس پیٹھ یعنی یونیورسٹی کے بارے میں متضاد قسم کے انکشافات پڑھنے کو ملے اور میں نے ارادہ کرلیا کہ میں شاردا جاکر بہ چشم خود دیکھوں گا کہ آخر بودھ عالموں نے دنیا کی اس عظیم درسگاہ کے لئے وادئ کشن گنگا کے اس مقام کو کیوں منتخب کیا۔ جہاں پہنچنے کے لئے سالہا سال کا وقت درکار ہے۔

بنگال سے سری نگر یا گلگت پہنچنا بجائے خود اُس زمانے میں ایک بڑے کار نامے کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ لیکن اُس کے آگے شمال یا شمال مغربی ملک کاشمر

سے اس مقام تک پہنچنا ایک کارے دارد والا معاملہ تھا۔ یہ سفر یا تو جنّات، بھوت پریت اور دیومالائی اور آسیبی مخلوق ہی کر سکتی تھی، عام انسان کے بس کی بات نہ تھی۔ مافوق الفطرت کرداروں کی یہ بستی اُس ناقابل یقین داستاں کا منظر نامہ پیش کرتی تھی۔ جس کے کردار 'شاردا مائی' نارده مائی' اور کچھ دیوی دیوتا ہیں جو ہزاروں سالوں سے بلند چوٹی K2 کے دامن میں اور نانگا پربت پہاڑی سلسلے میں سکونت پذیر رہی ہیں۔

14 اپریل 1987ء کو میں اپنے ایک دوست ڈاکٹر محمد صدیق کیانی کے ہمراہ مظفر آباد سے اپنی اس نوعیت کے پہلے سفر پر روانہ ہوا۔ موسم خراب تھا۔ اٹھمقام (مظفر آباد سے 64 کلومیٹر) وادئ نیلم میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ آگے سڑک بند ہے کئی ندی نالے طغیانی کی حالت میں ہیں۔ اور مظفر آباد تاؤبٹ قومی شاہراہ پسیاں گر آنے سے بند ہے۔ رات اٹھمقام میں کیانی صاحب کے ایک دوست جو محکمۂ زراعت میں ملازم تھے کے گھر گذاری۔ دوسرے دن اٹھمقام سے پیدل واپسی کا سفر شروع کیا۔ کیونکہ پیچھے بھی سڑک بند ہو چکی تھی۔ بیس کلومیٹر پیدل چلنے کے بعد ایک ٹھکیدار نے اپنی گاڑی میں چھلیانہ پہنچایا۔ وہاں سے نوسیری تک پیدل چلے۔ آگے ایک اور گاڑی کے ذریعے واپس مظفر آباد آ گئے۔ اس ادھورے ناکام سفر کا مجھے بہت دکھ ہوا۔ اس کے بعد دو مرتبہ مظفر آباد گیا۔ ستمبر 2014ء میں جب وادئ کشمیر میں شدید سیلاب آیا ہوا تھا، میں مظفر آباد میں بارش رکنے کا انتظار کر رہا تھا۔ دوستوں نے بارش میں 'شاردا' کا سفر کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اپریل 2016ء میں بھی مظفر آباد میں تھا، لیکن ناسازی طبیعت کے سبب 'شاردا' کا سفر نہ کر سکا۔ یہ

سفر بار بار ملتوی کرنے میں میرے دوستوں کا بڑا حصہ ہے۔ 24 اگست کو میں کمان پُل ''امن سیتھو'' کے راستے مظفر آباد پہنچا۔ ایک ہفتہ پہلے میں نے مظفر آباد میں مقیم اپنے دوستوں کو مطلع کر دیا تھا کہ اس مرتبہ میرا ''شاردہ'' کا پھر ارادہ ہے اور اس کے لئے مجھے اُن کی مشاورت اور کواپریشن کی ضرورت ہے۔ ادھر جموں و کشمیر اکادمی نے مجھے ایک Assignment سونپا تھا۔ جس کے لئے مجھے ''شاردہ'' سے متعلق ضروری معلومات جمع کرنا تھیں۔ کیونکہ ریاست میں ''شاردہ'' کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر دستیاب ہیں۔ (معلوم دور کے ابتدائی زمانے کے کچھ تذکروں میں کچھ معلومات ملتی ہیں، جو تشنگی ختم نہیں کر سکتیں، بلکہ بڑھاتی ہیں)۔

میں 24 اگست 2015 کو مظفر آباد پہنچا۔ اور اُسی شام میرے دوست نے مجھے 26 اگست کی تاریخ بتا دی۔ 25 اگست کو آرام کیا اور 26 اگست صبح 7 بجے ہم اُس سفر پر روانہ ہو گئے۔

میرے ہمراہ اس سفر میں آزاد کشمیر کے محکمۂ پی، ڈبلیو، ڈی کے سابق ڈائیریکٹر جنرل ملک افتخار، روزنامہ 'صبحِ نو' کے سردار محمد نسیم خان اور ایک عزیز شیر دل کھٹک بھی تھے۔ ہم لوگ ساڑھے نو بجے اشکوٹ پہنچے، جہاں ہمارے ساتھی شیر دل کے ایک رشتہ دار ضلع نیلم کے اکاؤنٹس آفیسر کا رہائشی کوارٹر تھا۔ اُنہوں نے ہمارے لئے ناشتے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ وہاں کچھ علم دوست حضرات سے ملاقات ہوئی۔ ایک مولانا صاحب نے اپنے طور سے 'شاردا' کالج کے پرنسپل کو فون پر ہماری آمد کی اطلاع دی اور مشن کا مقصد بھی بتا دیا۔ ہم ساڑھے گیارہ بجے

'شاردا' بوائز کالج پہنچے تو کالج کے اساتذہ بشمول پرنسپل خواجہ لقمان نے ہمارا استقبال کیا۔ چائے نوشی کے بعد پرنسپل صاحب نے اپنے ایک سٹاف ممبر پروفیسر رشید کو ہمارے ساتھ 'شاردا یونیورسٹی' دکھانے کے لئے Depute کیا۔ 'شاردا پیٹھ' کے باقیات (پتھروں کی دیواریں) سات ہزار سال پرانی ہیں۔ 63 سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ہم پتھروں سے بنی ہوئی دو محرابوں کے درمیاں سے اندر منادر کے صحن میں داخل ہوئے۔ وہاں سیکیورٹی کا مناسب بندوبست دیکھ کر خوشی ہوئی۔ سامنے ایک بہت بڑے بورڈ پر اس عالمی اہمیت کی درسگاہ کے بارے میں لکھی ہوئی تحریر دیکھی۔ اس میں کتاب الہند کے مصنف ابوریحان البرونی کا اس مندر کے بارے میں اُن کی کتاب سے اقتباس اور محکمۂ آثارِ قدیمہ حکومت پاکستان کا تعارفی نوٹ پڑھا۔ یہ مندر (درسگاہ) ساٹھ فٹ طویل اور پینتالیس فٹ چوڑا ہے۔ اس کی دیواریں 4/5 فٹ پتھر کی سلوں سے بنی یہ سات ہزار سال پہلے (بحوالہ 'شاردا یونیورسٹی' مصنف احسان الرحمان دانش) تعمیر کی گئی دیواریں امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں شکستگی کی صورت حال سے دوچار ہیں۔ زینوں سے اوپر Pillers میں سے ایک ستون ٹیڑھا سا ہو گیا ہے اور جھکا ہوا لگتا ہے۔ پتھروں کے بارے میں کہا جاتا ہے اور جیسے کہ میں نے دیکھا بھی کہ شاردا کے ہی نہیں بلکہ مجھے پٹن، پریہاس پورہ، بونیار مارتنڈ اور اونتی پورہ کے آثار یاد آ گئے، جہاں استعمال شدہ پتھر بھی مقامی نہیں لگتے۔ دریائے نیلم (سابق دریائے کشن گنگا) کے دائیں کنارے پر دریا کی سطح سے کافی بلندی پر تعمیر شدہ مندر کی دیواروں میں نصب چٹان نما پتھر اُس ٹیلے تک کیسے پہنچائے گئے ہیں، یہ ایک عقدہ ہی رہے گا جو کبھی وا نہیں ہو

گا۔ کھنڈرات کے اندر اور باہر کہیں کوئی ایسا پتھر نہ ملا، جس پر کوئی تحریر کندہ ہو۔ کوئی کتبہ یا تحریری ثبوت دستیاب نہیں۔ مقامی پڑھے لکھے حضرات نے بتایا کہ جو تختیاں اور کتبے کسی زمانے میں دریافت ہوئے ہیں، اُنہیں یا تو چرا لیا گیا ہے یا پھر توڑ پھوڑ کے بعد وہ مٹی کے نیچے دب گئے ہیں۔ بہت سے کتبے اور مورتیاں سرینگر اور ٹیکسلا کے عجائب خانوں میں لے جا کر رکھے گئے ہیں۔

ایک بزرگ نے کہا کہ 1956ء تک یہاں ایک بودھ بھکشو رہتا تھا، جو پاٹ پوجا کرتا رہتا تھا۔ جس کا کہنا تھا کہ بودھ دھرم مذہبِ اسلام کے بہت قریب ہے۔ ایک دن یہ پجاری اچانک غائب ہو گیا (بحوالہ 'شاردا کے ارتقائی مراحل'...... خواجہ عبدالغنی)۔

میں کسی ایسے پتھر، تختی یا کتبے کی تلاش میں تھا، جس پر 'شاردا' رسم الخط میں کوئی تحریر کھدی ہوئی ہوتی۔ لیکن ناکام رہا۔ میرے ساتھی بھی اِدھر اُدھر کسی زندہ ثبوت کی تلاش کرتے رہے۔

کم سے کم ڈیڑھ گھنٹے تک اس مشہور تاریخی درسگاہ میں رہنے کے بعد ہم گاؤں کے اندر بھی گئے اور پڑھے لکھے دیہاتی مرد و خواتین سے باتیں کیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں فخر ہے کہ ایک عظیم تہذیبی ورثے کے ہم وارث ہیں ۔ ہمارے اس گاؤں کا نام دنیا بھر کی علمی اور تاریخی کتب میں موجود ہے اور آج بھی سیاح اور محقق یہاں آتے ہیں۔ ہمیں اپنے گھر کی اہمیت کا اندازہ تب ہوتا ہے جب علماء، دانشور اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ دور دراز کے ملکوں سے آتے ہیں۔ یا قدیم تاریخی کتب اور تذکروں سے ہمیں ہمارے اسلاف کے کارناموں کا پتہ چلتا

ہے۔ گاؤں والوں کو مائی شاردا کے آستانے تک لے جانے والی سیڑھیوں کے زینوں کی تعداد کا علم کتابوں سے ہوا۔ اب اس گاؤں میں ماشااللہ پڑھے لکھے نوجوانوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے اور انہیں بہت کچھ معلوم ہے۔ ایک بزرگ محمد ایوب نے کہا کہ چونکہ 'شاردا یونیورسٹی' اور مندر اور اس کے نواح میں کئی تاریخی نوعیت کے مقامات ہیں، جن کا تاریخی پس منظر ایک مخصوص قسم کے غیر مسلم عقیدے کے لوگوں سے جُڑا ہوا ہے۔ اس لئے مقامی مسلمانوں اور حکومتوں نے اس تاریخی ورثے کی اہمیت کو نہ سمجھا۔ آج کی تاریخ میں 'شاردا پیٹھ' کی اہمیت کو پھر سمجھا جانے لگا۔ یہ مندر ہو یا مسجد یا کسی فرقے کی عبادت گاہ، بہر حال یہ ایک تاریخی ماخذ ہے اور ہمارے اسلاف کی تاریخ اس سے جُڑی ہوئی ہے۔

وادئ نیلم اور مظفر آباد کے چند اعلیٰ تعلیم یافتہ دانشور حضرات نے نیلم وادی اور شاردا کے حوالے سے کچھ تحقیقاتی کام کیا ہے، جو کتابوں کی شکل میں پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کی ہر بک شاپ پر دستیاب ہیں۔ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی میں بھی ان کتابوں کو متعارف کرایا گیا ہے۔ وادئ نیلم کے ایک گاؤں خواجہ سیری کے ایک محقق اور دانشور خواجہ عبدالغنی (صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول) نے 'شاردا تاریخ کے ارتقائی مراحل' کے عنوان سے ایک تحقیقی کتاب تحریر فرمائی ہے، جو شمالی کشمیر کی نانگا پربت پہاڑی سلسلے سے لے کر وادئ کشمیر کے مظفر آباد تک پھیلی ہوئی وادئ نیلم خصوصاً 'شاردا یونیورسٹی' کی ہزاروں سال کی سچی داستاں پر محیط ایک تاریخ ہے۔ جس میں مصنف نے مستند تاریخی حوالوں سے اس درسگاہ کی سماجی اور علمی خدمات پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب شاردا یونیورسٹی کے پرنسپل نے مجھے

عنائت کی۔ حالانکہ خواجہ عبدالغنی صاحب کو میرے شاردا میں وارد ہونے کا علم ہو چکا تھا اور وہ پیدل ہی اپنی جائے ملازمت سے شاردا کی طرف چل پڑے تھے، لیکن ہم تین بجے تک اُن کا انتظار کرتے رہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ چار بجے کالج پہنچ گئے تھے۔

اُن سے ملاقات کرنے اور کچھ سیکھنے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی، جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ دوسری کتاب جو خواجہ لقمان (پرنسپل صاحب) نے مجھے نذر کی، جناب سمیع اللہ عزیز منہاس (آرکی ٹیکٹ) کی 'ناگ سے نیلم تک' ہے۔ اس کتاب کے سرورق پر فاضل مصنف کا یہ دعوئ ہے کہ یہ وادئ نیلم کی دو ہزار سالہ مستند تاریخ ہے۔ پڑھنے کے بعد مجھے اعتراف ہے کہ تاریخ کے طالبعلموں اور سیاحت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب واقعی ایک نادر تحفہ ہے۔ 'تاریخ ثقافت نیلم' جناب رشید شاہ فاروقی کی کتاب ہے، جس کے سرورق کی تصویر میں دھان کے کھیت میں ایک لڑکا بیلوں کی جوڑی سے ہل جوت رہا ہے۔ جس سے یہ پیغام ملتا ہے کہ زراعت اس جنت کے ٹکڑے کے باسیوں کا بنیادی پیشہ اور ذریعہ معاش ہے۔ یہ کتاب میں نے مظفر آباد کے ایک بک سیلر سے خریدی۔ 'شاردا' سہ ماہی مجلّہ کے مدیر اعلیٰ بارہمولہ کے میرے ایک دوست اور ساتھی پروفیسر عبدالحمید کریمی ہیں جو آج کل مظفر آباد میں مقیم ہیں۔ 'شاردا' ایک تحقیقی مجلّہ ہے جو اُردو میں شائع ہوتا ہے۔ اور آزاد کشمیر یونیورسٹی مظفر آباد کا 'شعبہ ادارہ مطالعۂ کشمیر' شائع کرتا ہے۔

یہ مجلّہ ہزارہ یونیورسٹی کے پروفیسر راجہ رحمت علی خان نے مجھے دوسری چند مفید

نادر کتابوں کے ساتھ نذر کیا۔ جس کے لئے میں راجہ صاحب کا بے حد سپاس گزار ہوں۔ ادارہ 'اہتسام ادب' نیلم کے روح رواں جناب احسان الرحمان دانش نے اپنی کتاب 'شارداد یوی' مجھے اُس وقت پیش کی، جب 31 اگست کو ہماری بس چھتر ٹاٹا آفس سے لے کر ایل،او،سی (چکوٹھی کی طرف چل پڑی۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ دانش صاحب جو کم سے کم ایک درجن تحقیقی، تاریخی اور ادبی کتابوں کے مصنف ہیں۔ سری نگر کے سفر میں میرے ہمراہ ہیں۔ ہم ایک ہی سیٹ پر بیٹھ گئے اور سلام آباد اوڑی تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ جن کتابوں کا میں نے اوپر ذکر کیا، گزشتہ ستر برسوں میں ان کے علاوہ کوئی کتاب نیلم یا شاردا کے حوالے سے دستیاب نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منشی محمد دین فوق اور بیٹس (Bates) معلوم دور کے مورّخ ہیں، جنہوں نے تقسیم ریاست سے پہلے اپنی کتابوں میں اس تاریخی مقام کا ذکر کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی اور قلمکار نے بھی پرانی تواریخ کھنگال کر 'شاردہ' کے حوالے سے کچھ لکھا ہو۔ لیکن جب وہاں پتھروں اور سِلوں کے سوا کچھ نہ بچا تو کسی نے وہاں جانے کی زحمت گوارا نہ کی۔ تاریخ اور آثارِ قدیمہ اور تہذیب و ثقافت کی اہمیت سے نا آشنا لوگوں کو آج احساس ہونے لگا ہے کہ ماضی کی شاندار اور درخشاں تہذیب کو بھلانا آسان نہیں۔ ہماری جڑیں 'ماضی' میں پیوست ہوتی ہیں۔ اس علاقے کے لوگوں کو اس حقیقت کا احساس ہونے لگا ہے کہ جڑوں کے بغیر کوئی شجر پنپ نہیں سکتا۔

'شاردا' کالج کے پرنسپل صاحب نے ہماری چار رکنی ٹیم کے لئے لنچ کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر کالج کے سٹاف کے ساتھ تبادلہ

خیال ہوا۔ اور اس دیومالائی خطۂ ارضی کے حوالے سے گفتگو کے دوران میری معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ پروفیسر وقار میر جو سماجی علوم کے اُستاد ہیں، نیلم وادی کی سماجی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی کے بارے میں اُن سے معلوم ہوا۔ اُنہوں نے بتایا کہ وادئ نیلم کی مجموعی آبادی کا دس فیصد حصہ کشمیری بولنے والوں پر مشتمل ہے۔ دوسری زبانوں میں پہاڑی زبان اسی 80 فیصد اور دس فیصد شینا اور گوجری بولتے ہیں۔ شینا اور دردی انتہائی شمالی علاقے کیل اور تاؤبٹ میں بولی جاتی ہے۔ تاؤبٹ میں کشمیری بولنے والے چالیس فیصد لوگ رہتے ہیں۔ پہلے نمبر پر خواجہ سیری کا گاؤں ہے جہاں تقریباً اسی فیصد لوگ کشمیری بولنے والے رہتے ہیں۔ جن دوسرے دیہات میں کشمیری خاصی بڑی تعداد میں آباد ہیں، اُن میں سرداری، کریم آباد، نیکرو، شنڈ داس، سیندار، سیری، دوسٹ سیری، تیزیاں، دُڈھنیال، دواریاں، کوشر نار، رواّت بالا، ناگدر، کل ملا کر ۱۴ دیہات میں کشمیری بولنے والے رہتے ہیں۔

وادئ کشمیر میں مختلف اضلاع میں ایسے چھوٹے بڑے گاؤں ہیں جن کے نام کے آگے پیچھے ناگ، بل، پور، گام، ہوم، مولہ، گنڈ اور کوٹ وغیرہ لاحقے لگائے جاتے ہیں۔ ایسے ہی لاحقوں والے کچھ گاؤں اس وادی میں بھی ہیں۔ جیسے شاہ کوٹ، اشکوٹ، دھن کوٹ، میرپور، اسلام پور، کھری گام (گنجوں کا گاؤں) سام گام، سی گام، سہہ گام۔ یہاں کے لوگوں کے رشتے کپواڑہ، لولاب، سوگام، گریز، تلیل، مچھل، لیپا، بانڈی پور، چوکی بل، کرناہ، ٹیٹوال، کیرن وغیرہ

دیہات کے لوگوں کے ساتھ ہیں لیکن ۹۹ فیصدی لوگ ایسے ہیں جو کبھی ایل،او،سی کے اس طرف اپنے رشتے داروں سے ملنے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کشمیر سرینگر میں ہے۔ اُن کے دلوں میں کشمیر کی بے پناہ محبت ہے اور کشمیر کو دیکھنے کا شوق جنون کی حد تک ہے۔ خواجہ سیری اور اٹھمقام میں خواتین، ویلویٹ (مخمل) کا ڈھیلا اور لمبا کرتا پہنتی ہیں۔ جنہیں 'پھیرن' کہتے ہیں۔

پروفیسر میر میرے ساتھ یونیورسٹی سیڑھیاں اُتر رہے تھے۔ دونوں طرف کچھ خودرو سبزیاں دیکھ کر میں رُک گیا۔ میں نے اس سے ان سبزیوں کے نام پوچھے تو اُس نے وہی نام بتائے جو وادی کے دیہات میں بولے جاتے ہیں مثلاً ہند، اج، نونر، سوژل، کرژھ، دروب، گنہار، لسہ وغیرہ۔ یہاں کے لوگ کرم کے ساگ کو بہت پسند کرتے ہیں۔ مکّی، شالی اور گل آفتاب (سُورج مکھی) کی کاشت ہوتی ہے۔ (اس علاقے کے لوگوں نے گل آفتاب کا نام نہیں سنا ہے بلکہ اس زرد رنگ کے خوبصورت پھول کو وہ سُورج مکھی کہتے ہیں)۔ اخروٹ، سیب، خوبانی، چیری یعنی گلاس، بگوگوشہ، اوربہی جیسے میوے بھی وافر مقدار میں اُگائے جاتے ہیں۔ مردوں کے ساتھ خواتین کو بھی لیتری (اجتماعی گھاس کٹائی) میں مصروف دیکھا۔ لوگ عموماً محنتی ہیں۔ اسی لئے جسمانی طور پر وہ صحت مند، پھرتیلے ہوتے ہیں۔ کسرتی بدن، اونچا قد، چوڑی چھاتی، رنگ زعفرانی اور خوش مزاج لہجہ، فنون لطیفہ کے شوقین، مہمان نواز اور ایمان کی دولت سے مالا مال۔ پوری نیلم وادی میں خواندگی کی شرح پچاس سے پچپن فیصدی کے درمیان

ہے۔ پاکستان کے زیرِ انتظام دوسرے اضلاع کی طرح ضلع نیلم کے بھی بیس فیصد لوگ بیرونی ممالک جیسے خلیج فارس کی ریاستوں، دوبئی، شارجہ اور سعودی عرب کے علاوہ مغربی ممالک بشمول برطانیہ بسلسلہ روزگار چلے گئے ہیں۔

'شاردا پیٹھ' کے بارے میں مزید تفصیلات رقم کرنے سے پہلے وادیٔ کشن گنگا (نیلم) کی تاریخ، جغرافیہ، تہذیب وثقافت کے بارے میں حاصل شدہ معلومات کا ذکر کرنا ضروری اور مناسب سمجھتا ہوں۔ کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ وادیٔ نیلم ایک چھوٹا کشمیر ہے۔ جہاں ہر وہ چیز کم وبیش دیکھنے کو ملتی ہے جو وادیٔ کشمیر اور اس کے ملحقہ علاقہ جات میں گزشتہ ہزاروں سالوں سے موجود ہے اور فطرت کی عکاس ہے اور سماجی رشتوں کو استوار کرتی ہے۔ میں نے اٹھمقام سے تھوڑے ہی فاصلے پر جہاں ملک افتخار کی گاڑی خراب ہوگئی تھی جس کی مرمت کرانا مقصود تھا۔ ملک صاحب نے گاڑی کو ایک ورک شاپ کے سامنے کھڑا کر کے کہا کہ آدھ گھنٹہ لگے گا۔ میں شاہراہ پر تھوڑا آگے ٹہلنے نکلا۔ سڑک کے کنارے ایک نوجوان خاتون کو اخروٹ کے ایک پیڑ سے ایک ڈنڈے سے اخروٹ اُتارتے دیکھا۔ ایک اخروٹ کو اس نے ایک کنکر سے توڑا اور اس کے اندر موجود گری کھانے لگی تو اچانک مجھے اپنے گاؤں کی یاد آگئی۔ جہاں ہم بھی اخروٹ توڑ توڑ کر کھاتے تھے۔ ایک دم ویسا ہی پیڑ ویسی ہی ایک مرلہ زمین کا ٹکڑا۔ اس میں بیٹھ کر پتھر کے ٹکڑے سے اخروٹ توڑ کر گریاں چبانا۔ میں نے اس خاتون سے پوچھا ''ایک دو اخروٹ عنایت فرمائیں گی.....؟'' اس نے چار پانچ اخروٹ میری جانب اچھالتے ہوئے کہا .....''کھایئے، اگر اور ضرورت ہیں تو میں اُتار کردوں گی''۔ میں نے شکریہ ادا کیا

تواس نے پھر پوچھا..... ''آپ یہاں کے نہیں ہیں۔ کہاں رہتے ہیں؟''۔ میں نے کہا ''میں انڈیا والے کشمیر سے آیا ہوں''..... ''اوہ! اِدھر آپ کا کون ہے؟''..... ''سب اپنے ہیں۔ کچھ رشتہ دار عزیز، کچھ دوست''..... ملک صاحب نے آواز دی ''آیئے چلیں''۔

قدیم راستے اور گزرگاہیں

یہاں وادیٔ نیلم کو سری نگر جموں اور گلگت بلتستان سے ملانے والی خاص گزرگاہوں کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ معروف محقق پروفیسر مشتاق احمد خان پرسچہ کے تحقیقی مقالہ کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

(۱) وادیٔ کشمیر کے شمال مغرب میں 'تُت مار گلی' (سطح سمندر سے بلندی ۱۱ہزار فٹ) وادیٔ لیپا۔

(۲) کشمیر کے شمال مغرب میں 'نتھ چھن گلی' (موجودہ سادھنا گلی 1200 فٹ بلند) عبور کر کے کرناہ ٹنگہ ڈار سب ڈویژن آتا ہے۔

(۳) کشمیر کے شمال میں 'پھرکیاں' گلی (بلندی ۹۰۰۰افٹ) عبور کر کے وادیٔ کیرن۔

(۴) کشمیر کے شمال میں 'مچھل' گلی (بلندی ۱۰۰۰افٹ) عبور کر کے کیل۔

(۵) کشمیر کے شمال میں جمعہ گنڈ گلی (بلندی ۱۰۰۰۰افٹ) عبور کر کے تیجن۔

(۶) کشمیر کے شمال مغرب میں لولاب سے کنزل ون وہن مرگ کے راستے تاؤٹ۔

(۷) نیلم سے اسکردو ڈکیل ہنس مرگ دیوسائی (یہ راستہ نیلم کو کرگل لداخ اور گلگت سے ملاتا ہے)۔ ۱

(۸) نیلم سے استور راستہ شونٹھر گلی (یہ راستہ بلتستان سے ملاتا ہے)۔ ۲

(۹) نیلم سے چلاس براستہ شاردا سرگن دومیلا کماں ڈوری نیاٹھ (گلگت و بلتستان وشمالی علاقہ۔ ۳

(۱۰) نیلم سے ناران کاغان راستہ دواریاں رتی گلی (.........)۔ ۴

(۱۱) نیلم سے پارس (کاغان) براستہ شخاران گلی راجہ بھوگی۔

(۱۲) نیلم سے لوڑاولی (کاغان) براستہ سرگن نوری ناڑ۔

۱ ون ۲ رن ۳ رن ۴ رن ب

نوٹ:- راقم الحروف نے وادئ نیلم کا سفر بذریعہ چہلہ بانڈی کیا ہے۔ مندرجہ بالا تمام درے اور گلیاں نمبر ۱ تا ۶، 1947 سے قبل کھلے رہتے تھے۔ نمبر ۷ سے ۱۲ یہ راستے آج بھی کھلے ہیں، لیکن سارے پاکستان کے زیر انتظام کشمیر سے شروع ہو کر اسی علاقے میں ختم ہوتے ہیں۔ ان مقامات سے آگے ملک چین کی سرحدیں شروع ہو جاتی ہیں۔

ایک اور مجلہ 'صدائے نیلم' (مارچ تا مئی 2014ء) کا ایک اقتباس قدیم راستوں کے حوالے سے ملاحظہ ہو۔

☆ دودنیال (نیلم) سے سوپور' کنڈل شاہی' درل بٹا کنڈی (کاغان)

براستہ ترگلی پاس۔

☆ کنڈل شاہی (نیلم) درل سے ماندری کاغان براستہ بشالاس پاس۔

☆ کنڈل شاہی نیلم سے منور کاغان براستہ شکار پاس۔

☆ درل سے بالا مظفر آباد براستہ سرسنگا پاس۔

☆ دواریاں (نیلم) سے بٹا کنڈی براستہ رتی گلی۔

☆ گریز سے استور براستہ شنگر مالا۔

☆ گریز سے بانڈی پورہ۔

☆ کنزل ون سے استور براستہ لگئی کیرن سے شالہ پورہ (کشمیر براستہ پتھرا گلی)۔

کہا جاتا ہے کہ لولاب کی کلاروس سرنگ بھی اس لئے بنائی گئی تھی تاکہ وادئ کشمیر سے آسانی کے ساتھ تاؤبٹ تا گلگت تک کا سفر ہو سکے۔ (راجہ نذر بونیاری کا مولانا مسعودی کے ساتھ ایک انٹرویو۔ (1985)

'کدل' اور 'تار'

'شاردا' جانے کے لئے غیر منقسم کشمیر سے چار اہم گزرگاہوں کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ ایک گلگت سے تاؤبٹ، کیل اور 'شاردا' دوسرا وادیٔ گریز سے 'شاردا' تیسرا سری نگر سے براستہ کپوارہ، ٹیٹوال، اشکوٹ، 'شاردا' اور چوتھا راستہ چکری بہک موجودہ مظفرآباد سے ڈنی بہیاں...... پرسچہ اور مظفرآباد سے یہ راستہ دوسری پہاڑی گزرگاہوں سے نسبتاً بہتر مانا جاتا تھا۔ کیونکہ یہ دریائے کشن گنگا (موجودہ نیلم) کے دونوں کناروں سے ہوتا ہوا 161 میل لمبی اس خوبصورت وادی کے آخری کنارے تاؤبٹ تک جاتا تھا اور پھر چند دشوار گزار درّوں سے گزر کر گلگت میں داخل ہو جاتا تھا۔ مظفرآباد سے تاؤبٹ تک درجنوں پُل جنہیں کدل کہتے تھے مقامی لوگوں نے بنائے ہوئے تھے۔ یہ پُل حطب کی ٹہنیوں کو تاؤ دے کر اور مروڑ کر رسوں میں تبدیل کرنے کے بعد اُنہیں آر پار مضبوط درختوں سے باندھ کر تیار

کئے جاتے تھے۔ ایک سو سال پرانے تذکروں میں ایسے کدلوں کا ذکر آیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کشن گنگا کو کیسے عبور کیا جاتا تھا۔ اُس کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں ملتا۔

عہدِ قدیم کے انسان نے جب دریاؤں اور ندی نالوں کے کنارے بستیاں بسائیں۔ اُسی دن سے ہی اس کی بقا کے لئے سفر اور مسلسل سفر لازم قرار پایا۔ اُن زمانوں کی بے سروسامانی، جنگلات سے اٹی زمینیں، پُرخطر پگڈنڈیاں، خوفناک درندوں سے بھرے پہاڑ اور جنگلات، ہولناک کھائیاں، کمرتوڑ چڑھائیاں، موسمی شدائد، منہ زور بپھرتے پانی اور غیر یقینی صورت حال...... کشن گنگا کا پانی موسم سرما میں منجمد ہو جاتا ہے۔ دونوں اطراف کی ڈھلوانوں اور پہاڑوں سے برف کے تودے اور گلیشر آ کر اس دریا میں گرتے، تو اُس پر سے بہ آسانی عبور کیا جاتا مگر جب گرمیوں میں برف پگھل جاتی اور پہاڑوں سے چھوٹی چھوٹی ندی نالوں کا پانی آ کر کشن گنگا میں گرتا تو دریا کی سطح بہت اونچی ہو جاتی۔ جس کی وجہ سے اسے عبور کرنا ناممکن بن جاتا۔ اس صورت میں نسبتا! کم پاٹ والے مقامات پر نالوں کے آر پار لکڑی کے بڑے بڑے شہتیر رکھ دئے جاتے۔ جن کے کناروں میں سوراخ کر کے انہیں آر پار رسوں سے باندھ دیا جاتا۔ اس طرح کے کراسنگ 'لاہنگ' کہلاتے تھے۔ اُن پر سے گزرنے کے لئے مضبوط اعصاب کی ضرورت ہوتی تھی۔ جن مقامات پر دریا پایاب ہوتے، اُنہیں مقامی ہندکو زبان میں 'چھاک' کہتے ہیں۔ کوٹلی اور پٹھوہاری زبانوں میں 'تھہہ' کہتے ہیں۔

'1947ء' اکتوبر تک چھلہ بانڈی میں یہ 'چھاگ' موجود تھا۔ اور قبائلی پٹھانوں کو مظفرآباد لانچ کرنے کیلئے استعمال ہوا۔ جنہوں نے ماکڑی ہائیڈرو پاور

سٹیشن اُڑا دیا۔ اور مظفر آباد پر ہلہ بول دیا مظفر آباد سے نیلم ویلی کا پہلا کدل کراس کرتے ہی چہلہ بانڈی کا تاریخی گاؤں آتا ہے، جو دریائے نیلم کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ اس مقام پر نیلم کے درمیان سے اُبھری ہوئی ایک چٹان کو ''پنج پیراں دی گٹ'' کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس جگہ دریا عبور کرنے کے خواہشمند پانچ بزرگوں کی برکت سے پانی کا بہاؤ رک گیا۔ اور پانچ بزرگ بہ آسانی پا پیادہ چل کر دریا پار اُتر گئے۔ یہ روایت اس امر کی غماز ہے کہ اُس دن نیلی دندی سلائیڈ ہوتی رہی اور دریا کا بہاؤ رکتا رہا۔

حضرت انسان نے تیراکی شاید جانوروں سے سیکھی ہے۔ گزرے زمانے میں دریاؤں کے کناروں پر بسنے والوں کے لئے تیرنا اتنا ہی اہم تھا جتنا کھانا پینا۔ مظفر آباد اور ہزارے کی مقامی زبانوں میں دریاؤں کے جو مقامات تیراکی کے لئے باعث خطرہ نہ تھے، اُنہیں ''تار'' یا ''تر'' کہا جاتا تھا اور تیراک کو ''تارو'' کہتے تھے۔ ایسے ''تار'' بارہمولہ سے کوہالہ تک جہلم پر موجود تھے۔ مگر اوڑی، چناری، گڑھی دومیل، اکڑا حسن آباد، پتن اور کوہالہ کے ''تر'' مشہور تھے۔ زیرین نیلم وادی میں دھنی منڈل، ہڑاماں، چہلہ، ماکڑی، کنڈھ، بیلہ نور شاہ پتن تر دیرا نیلم پُل مظفر آباد میں ''تر'' ہوا کرتے تھے۔

مشہور گزرگاہیں ''پتن'' کہلاتی تھیں۔ جہاں پیشہ ور ملاحوں کی بستیاں آباد تھیں۔ پنجابی اور پہاڑی میں ان ملاحوں کو ''مہانے'' یا ''موڑ'' کہا جاتا تھا۔ مہانوں کے پاس بکری کی کھالوں سے بنائے ہوئے اور ہوا بھر کر پھلائے گئے تکیوں اور سرہانوں جیسے غبارے نما مشکیں بنائی جاتیں۔ انہیں مقامی زبان میں

''دکھلیں'' کہتے تھے۔

مرد مسافروں کو پشت پر بٹھا کر دریا عبور کیا جاتا، مستورات اور بچوں کو چمڑے سے بنی ہوئی چارپایوں پر بٹھا کر باندھ دیا جاتا۔ مہانوں کا ایک اور گروہ کانگڑے کہلاتا تھا۔ یہ لوگ کانگڑہ ہماچل پردیش کے ہوتے تھے جو 'مہان' کے ماہر ہوتے تھے۔ برطانوی فوج کے ایک افسر لیفٹیننٹ لمسڈن نے اپنی یادداشتوں میں اور معروف آسٹریلوی سیاح بیرن ہیوگل نے اپنے سفرنامے Travel in Kashmir and Punjab میں مظفر آباد کے گھاٹوں کے ساتھ ایک اور گھاٹ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جو موجودہ زیارت شاہ سلطانؒ کے عین نیچے نیلم پر واقع ہے۔ کشتی کو مقامی زبان میں ''بیڑی'' کہتے تھے۔ اور گھاٹ بھی اسی نام سے موسوم تھا۔ مظفر آباد کے آخری سلطان حسین خان المتوفی ۱۸۵۹ء کے زمانے میں کسی مقامی شاعر نے اُنہیں مخاطب ہو کر شہر کے اطراف چار گھاٹوں کی نشان دہی کی ہے۔

''چار بیڑیاں نوکر تیرے، حسن آباد ہے تیرا ڈیرہ''

معروف گھاٹوں سے دریا عبور کرنے کے لئے رسوں کے پلوں کی سہولت بھی موجود ہوا کرتی تھی۔ مقامی زبان میں وہ پُل ''کدل'' کہلاتے تھے۔ کدل سے گزرنا پُل صراط سے گزرنے کے برابر تھا۔ ایک مقامی شاعر 'پیلوؔ' نے اس صورت حال کی تصویر کچھ اس طرح کھینچی ہے۔

''ایہہ کدل نئیں ایہہ اجل ہے نڈمر نیدی گج
نس وا پیلو شاعرا، روزِ قیامت اج''

مظفرآباد سے دوسٹ تک اس قسم کے ۹ کدل تھے، جو چہلہ بانڈی، کہوڑی، پرسچہ، کہنڈی، سالخلہ، دواریاں، چانگاں، ہیز بیلہ اور دوسٹ۔ نیلم پر دواریاں والا کدل 1975ء تک موجود تھا۔ مظفرآباد سے تاؤبٹ کے درمیان جو درمیانی راستے آتے ہیں ان کے نام ہیں ناگدر، نوسیری، روات بالا، دواریاں، کوشرناڑ، ددھنیال، تیجیاں، دوسوٹ سین، سیری، کنڈل شاہی، شینڈر، شُنڈ داس، نیکرُو، کریم آباد، بلمت، سرداری، خواجہ نوسیری اور تاؤبٹ۔ تاؤبٹ ضلع نیلم کا اخری پڑاؤ مانا جاتا ہے۔

پورے ضلع میں تقریباً 20,000 بیس ہزار نفوس کشمیری بولتے ہیں۔ جو مجموعی آبادی کا 10 فیصد ہے۔ مظفرآباد کی سطح سمندر سے اونچائی 1340 میٹر جبکہ شاردا کی بلندی 6450 میٹر ہے۔

ا پروفیسر مشتاق احمد پرسچہ (سہ ماہی شاردا 'راستے اور رابطے')۔

'کدلوں' اور 'تاروں' کا ذکر درمیاں میں خاص وجہ کے لئے کیا گیا۔ دراصل یہ دونوں الفاظ کشمیری زبان میں من وعن مستعمل ہیں۔ حالانکہ کدل اب رفتہ رفتہ سری نگر تک ہی محدود ہوکر رہ گیا ہے۔ کیونکہ شہر خاص سے لال چوک تک جہلم پر جو پُل تعمیر ہوئے ہیں۔ اُن کے نام کے آگے 'کدل' لاحقے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور 'تار' لفظ کا استعمال کشمیری زبان کی معروف کلاسکی صوفی شاعرہ 'للہ عارفہ' نے اپنے واکھوں میں استعمال کیا ہے، جس کے معنی ہیں، دریا عبور

کرنا، بیڑہ (کشتی) پار ہونا، مشکل آسان ہونا (محاورتاً) یا کسی آزمائش سے بہ آسانی بچ نکلنا وغیرہ۔ ا........اس باب میں 'مہان' اور 'بیڑی' جیسے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔

'مہان' دشوار گزار گھاٹیوں اور گہری کھائیوں میں بہنے والے پہاڑی ندی نالوں میں لکڑی (بالن ایندھن یا تعمیری لکڑی) بالائی علاقوں سے نشیبی بستیوں کی طرف (پانی میں) بہا کر لے جانے والے عمل کو کہتے ہیں، جنہیں خشکی کے راستے منتقل کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ یہ لفظ کشمیر میں پہاڑی علاقوں میں رہنے والے (کشمیری زبان بولنے والے) سوات، کاغان، ہزارہ، نیلم اور اور صوبہ سرحد میں بھی من وعن مستعمل ہے۔ 'بیڑی' کشتی کو کہتے ہیں۔ 'بیڑا' بہت سی کشتیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ اردو محاورے 'بیڑا پار ہونا'، 'بیڑا غرق ہونا'، 'بیڑا ڈوب جانا' میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ وادیٔ نیلم میں 10 فیصدی لوگ کشمیری نژاد اور کشمیری زبان بولنے والے رہتے ہیں۔ ان میں خواجہ، میر، بانڈے، ماگرے، پیر، قریشی، لون، شیخ اور بٹ شامل ہیں۔ لیکن اُن کا کہنا ہے کہ وہ اُس ٹہنی کی طرح ہیں جو درخت سے ٹوٹ کر یا کٹ کر گر گئی ہو اور اس کا زندہ 'ہرا' ہونا ایک معجزہ ہے۔۲

جیسا کہ میں نے ابتدائی جملوں میں ذکر کیا ہے کہ دریائے کشن گنگا (موجودہ نیلم) کے ٹو K2 28251 فٹ اور نانگا پربت 26660 فٹ دریا کے دامن میں دراس کی پہاڑیوں میں واقع جھیل رشنہ سے نکلتا ہے۔ اور تاؤبٹ میں پہنچ کر پاکستان کے زیرِ انتظام کشمیر میں داخل ہوتا ہے۔ اور دو سو میل سے زیادہ کا سفر کرتا ہوا مظفرآباد پہنچ کر دریائے جہلم سے آکر بغل گیر ہو جاتا ہے۔ جیسے دو بچھڑے بھائی

مدتوں بعد ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔اس مقام کا نام 'دومیل' یعنی دو کا میل اور پھر آگے کا سفر دونوں مل کر طے کرتے ہیں۔ایک کلومیٹر بہنے کے بعد بھی دونوں پانیوں میں رنگوں کے اعتبار سے تفاوت اور فرق صاف عیاں ہوتا ہے۔نیلم کا پانی وادئ نیلم میں کھیتی باڑی اور پینے کا کام برائے نام ہی آتا ہے۔کیونکہ یہ دریا بستیوں سے نیچے کافی گہرائی میں بہتا ہے۔اس لئے زراعت کے لئے بالائی سطح پر بہنے والے چھوٹے چھوٹے ندی نالے ہی کام آتے ہیں۔لیکن نوسیری کے مقام پر اس دریا کے پانی سے ایک بڑا پن بجلی پروجیکٹ زیر تعمیر ہے، جس سے 1500 میگا واٹ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت کا اندازہ ہے۔کہا جاتا ہے کہ اس دریا کا شفاف بلورین ٹھنڈا پانی ہاضمے اور بھوک کے لئے مفید ہے۔قدیم شاستروں اور تذکروں میں لکھا ہے کہ اس دریا میں سونے کے ذرات وافر مقدار میں ملتے ہیں ،جیسا کہ سندھ کے بارے میں بھی مذکور ہے۔یہ بات ماہرینِ طبقات الارض نے بھی ثابت کی ہے کہ لداخ اور کرگل کے پہاڑوں میں سونا اور چاندی کے ذخائر پائے جاتے ہیں۔گلگت، چلاس، یاسین اور اسکردو کے لوگوں نے اس بات کی تصدیق کی ہے۔لیکن سونے کے لئے لوگ اپنی جان جوکھم میں نہیں ڈالنا چاہتے۔کیونکہ اس دریا کے پانی کی روانی بے حد تیز ہے۔اور اکثر مقامات پر دریا خشم اور غصے میں لگتا ہے۔جب یہ مجنون کی طرح اپنا سر بڑی بڑی نوکیلی چٹانوں اور پتھروں سے ٹکراتا، شور کرتا، گاتا، چنگھاڑتا ہوا بہتا ہے۔مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ بیرونی حملہ آور اور سیاح شاید 'سونے' کی وجہ سے اس دشوار گزار علاقے کا سفر کرتے تھے۔نیلم اور سونے کی عدم دستیابی کی صورت میں وہ قیمتی معلومات واپس

لے جاتے جو شاید سونے کے ذخائر سے بھی زیادہ اہم اور قیمتی ہیں۔لیکن یہ سونا آخر کہاں گیا؟ اس کا ذکر آگے چل کر شاردا مائی اور نادرا مائی کے باب میں آئے گا۔

۱۔ لل دید کا ایک مشہور واکھ ہے ''کتہِ بوزِ دَے مئون، مئیتہِ دِی تار'' ۲۔

ڈگری کالج کے پرنسپل صاحب اور کچھ سٹاف ممبران نے میرے ساتھ کشمیری زبان میں باتیں کیں۔مجھے اس لمحے ماحول کچھ جذباتی سا محسوس ہوا۔پروفیسر لقمان صاحب نے مجھے وہاں زیر تربیت بی ایڈ طلباء اور طالبات کو ایڈریس کرنے کی فرمائش کی۔جب میں اپنے ساتھیوں کے سمیت کلاس روم میں داخل ہوا تو طلباء طا لبات نے کھڑے ہو کر تالیوں سے میرا استقبال کیا۔مجھے بتایا گیا کہ وہاں موجودہ 37 زیر تربیت اساتذہ میں سے 25 کشمیری زبان بونے والے ہیں۔ایک طالبہ نے مجھے کہا ''میرے ابو آپ کو جانتے ہیں''۔یہ اُس نے کشمیری میں کہا اس کے فوراً بعد نہ جانے اُسے کیا ہوا کہ چکرا کر فرش پر گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی۔اُسے پرنسپل کے روم میں لے جایا گیا۔اُس کے اوپر نیلم کے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ڈالے گئے اور اُسے ہوش آ گیا۔ (نذر)

وادیٔ نیلم کو حاصل منفرد اعزازات

۱۔ مشہور تاریخی یونیورسٹی (بودھ وہار اور مندر) 'شاردا پیٹھ' اسی وادی میں تھا۔

۲۔ صحابۂ کرامؓ بسلسلہ تبلیغ و جہاد وادیٔ نیلم کے گاؤں سالخلہ چیچ ور (ارشی میں آ کر مدفون ہیں۔ (تاریخ اولیائے نیلم، رشید فاروقی)

۳۔ مولانا انور شاہ، محدث کشمیریؒ پر 16 افراد پی، ایچ، ڈی کر چکے ہیں۔

۴۔ علمائے عرب و عجم نے اُنہیں (مولانا انظر شاہ کشمیریؒ کو) امامِ ابوحنیفہؒ ثانی کا خطاب دیا ہے۔ یہ اعزاز اُن کے بغیر کسی کو حاصل نہیں۔

۵۔ متحدہ کشمیر میں سب سے پہلے مرزائیوں کے خلاف تحریک چلانے کا اعزاز محمد سعید مسعودی کو حاصل ہے۔

۶۔ مولانا محمد اسماعیل شاہ بارہمولہ، مظفر آباد، کپوارہ پر مشتمل ایک پہاڑی

ریاست بنانا چاہتے تھے۔ اس کا تانا بانا بھی تیار کر لیا گیا تھا۔ مگر 1947ء کے انقلاب کی وجہ سے اس منصوبے پر عمل درآمد نہ کر سکے۔

۷۔ وادیٔ نیلم کے لوات کے نذیر احمد مسعودی جموں و کشمیر حکومت میں سیکرٹری ریٹائر ہوئے۔

۸۔ مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے لئے مشہور مقدمے بہاول پور میں مولانا انور کشمیریؒ مسلمانوں کی طرف سے دلائل دینے کے لئے متفقہ نمائندے مقرر ہوئے۔

۹۔ 1947ء وادیٔ نیلم میں پھنسے ہوئے غیر مسلموں کو میاں عبد الرشید نے بحفاظت اُن کے گھروں تک پہنچایا۔ کسی ایک کو ایک خراش تک نہ آنے دی۔

رشید فاروقی صاحب نے ایک انکشاف فاروق نیازی ایڈووکیٹ کے حوالے سے کیا ہے، جس میں فاضل ایڈووکیٹ نے اُنہیں بتایا کہ 13 جولائی 1931ء کو سرینگر سنٹرل جیل کے باہر مجمع سے جس شخص نے خطاب کیا تھا وہ غلام مصطفےٰ مسعودی تھے۔ جس نے وہاں آتشیں تقریر سے ''آگ'' لگا دی تھی۔ اُن ایڈووکیٹ صاحب کے والد اُس وقت سی، آئی، ڈی کے ہیڈ کانسٹیبل تھے۔ جس نے بتایا کہ اُنہوں نے جان بوجھ کر غلام مصطفےٰ کو بچانے کے لئے عبد القدیر کا نام اپنی خفیہ ڈائری میں لکھ دیا تھا۔ (واللہ اعلم)

میں دو عمر رسیدہ بزرگوں خواجہ غلام رسول بانڈے ساکنہ کھوٹہ باغ (سابق پونچھ) اور ملک فیروز ساکنہ مظفر آباد سے وادیٔ نیلم سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ کچھ زیادہ نہ بتا سکے۔ ملک فیروز

الدین عمر 91 سال نے بتایا کہ وہ بسلسلۂ تجارت مال مویشی، دودھ، گھی اور گچھی وادئ نیلم کے مختلف دیہات میں لے جایا کرتے تھے۔ اُنہوں نے ایک دکان ٹیٹوال میں بھی کھول رکھی تھی۔ ایک گودام مظفر آباد میں گڑھی بن میں تھا۔ میں گھی اور جڑی بوٹیاں ہری سنگھ ہائی سٹریٹ کے لالہ موٹا ناتھ کو فروخت کرتا تھا۔ اور الائڈ چراغ دین کے چھکڑے میں سامان لاتا اور لے جاتا تھا۔ اُنہوں نے کہا کہ ٹیٹوال اور چلیہانہ کے درمیان نیلم پر ایک مہلک پُل تھا۔ چلیہانہ میں ایک دکان بھی نہ تھی جب کہ ٹیٹوال میں کم سے کم ۳۰ دکانیں تھیں، جن میں سے ۲۰ دکانیں ایبٹ آباد اور سرینگر کے کھتریوں کی تھیں۔ یہ لوگ زیادہ تر اناج، نمک، تیل، گھی، مکھن، کپڑے، تمباکو اور نسوار کی تجارت کیا کرتے تھے۔ ایک دکان سے دیسی جڑی بوٹیاں اور انگریزی دوائی بھی ملتی تھی۔ یہ دکان دار پیسے کے بجائے جنس ہی سے خریدتے تھے۔ گھی، مکھن، اُون، مرغے، انڈے لے کر سودا بیچتے۔ گھی ایک روپے میں کلو خریدتے ایک درجن انڈے ایک روپے میں۔

وجودِ عالم اور ظہورِ آدم سے لے کر غیر فطری تقسیمِ ریاست تک اس 300 کلو میٹر طویل وادی کے دائیں بائیں اور انتہائی شمال مغرب کے فلک بوس پہاڑوں تک رابطے کے ذرائع صرف بے حد دشوار گذار پگڈنڈیاں اور دو سے تین فٹ چوڑے راستے ہوا کرتے تھے۔ جن پر سے انسان اور حیوان چل کر منزلوں تک پہنچتے۔ غلام رسول بانڈے عمر ۱۰۴ سال ۸ ستمبر ۲۰۱۴ء کو مظفر آباد (جہاں وہ مدینہ مارکیٹ کے قریب کی ایک گلی میں 1947ء سے رہائش پذیر تھے، نے بتایا کہ مظفر آباد سے تاؤبٹ تک 300 کلومیٹر سفر کے لئے ۸ دن درکار ہوا کرتے تھے۔

1860/67ء میں وزارتِ پہاڑی (مظفر آباد) کے وزیر وزارت کرنل گنڈو نے عوام کی سہولت کے پیشِ نظر وادئ کشن گنگا میں چھ فٹ چوڑی پگڈنڈی تعمیر کروائی بعد میں راوٹے سے جنگلات کی کٹائی کا اولین ٹھیکہ رائے بہادر لالہ ایشر داس کو ملا۔ کشمیر گورنمنٹ اور اُس کے درمیان یہ طے پایا کہ وہ پگڈنڈی کی توسیع اور مرمت بھی کرے گا۔ اسکے عوض مذکورہ جنگلات سے عمارتی لکڑی کے لئے ایک تعین کردہ تعداد درختوں کی کاٹ کر فروخت کرے گا۔ اس معاہدے کے نتیجے میں پگڈنڈی کی توسیع و مرمت ہوئی۔ اس کے بعد ڈوگرہ عہد میں متعدد فرموں کو ٹھیکے ملتے رہے۔ جن میں.......

۱۔ ہرکرشن لال اینڈ کمپنی
۲۔ جودھامل اینڈ کمپنی
۳۔ ایشرداس فارسٹ کمپنی
۴۔ اسپیڈنگ ڈنگا سنگھ اینڈ کو
۵۔ سوات فارسٹ کمپنی
۶۔ شیخ اللہ رکھا اینڈ برادرز
۷۔ کشمیر فارسٹ انڈسٹریز (منشی یوسف خان کراچی)

1951ء میں FWO نے مظفر آباد سے کہوڑی 1952 میں کہوڑی سے دھنی 1955ء دھنی سے نوسیری تک جیپ کی سڑک بنائی۔ 1961ء میں نوسیری

سے کیل تک آٹھ سال میں تعمیر ہوکر تیار ہوئی۔

آج وادیٔ نیلم میں ہر طرف سڑکوں کا جال ہے۔ ہر چھوٹا بڑا گاؤں پختہ سڑک سے جُڑا ہوا ہے۔ مظفرآباد سے تاؤبٹ تک تین سو کلومیٹر سے طویل سڑک کو شاہ راہ کا درجہ حاصل ہے۔ 1960 سے پہلے سڑک مہینوں بند رہتی تھی۔ لیکن آج زبردست بارشوں اور برفباری کے باوجود ایک یا دو دن سڑک بند ہو جاتی ہے۔ لوگ خوشحال ہیں اور خواندگی کی شرح 55 فی صدی ہوگئی ہے۔ آج نیلم جسے کسی زمانے میں مافوق الفطرت مخلوق کی سرزمین کہا جاتا تھا، کسی صورت میں دوسرے ترقی یافتہ علاقوں سے پیچھے نہیں۔ سو سال پہلے کی پسماندگی اب ایک بھولا بسرا خواب بن کر رہ گئی ہے۔ درختوں کی ٹہنیوں سے بنے پلوں کی جگہ آج کنکریٹ میں پختہ پُل، پختہ، خوبصورت اور رنگین ٹین کے چھتوں والے چار چار منزلہ رہائشی مکانات، سکولوں اور کالجوں کی شاندار عمارتیں، جدید سہولیات سے لیس ہسپتال اور طبی مراکز، خوبصورت مساجد، پریس کلب اور نیلم کے صدر مقام اُٹھمقام میں بنی ہوئی سرکاری عمارتیں، سڑکوں پر رواں دواں نجی اور سرکاری ٹرانسپورٹ اور سیاحوں کے لامتناہی سلسلے نے وادی کی شہرت کو عروج پر پہنچا دیا ہے۔

دریائے نیلم کا موجودہ نام (وجہ تسمیہ)

'تاریخ وثقافت نیلم' کے مصنف رشید شاہ فاروقی رقم طراز ہیں کہ کشن گنگا کو نیلم کا نام ملکہ نور جہاں نے دیا۔۱؎ ایک دفعہ وہ کشمیر جاتے ہوئے مظفرآباد میں رکی۔ تو وہ دریا کا نیلگوں پانی دیکھ کر چلا اُٹھی ''دیکھو اس پانی کا رنگ ہو بہو نیلم کی طرح ہے''۔ تب سے یہ نام مشہور ہو گیا۔ فاروقی صاحب نے یہاں 'مظفرآباد' صفحہ 142 کا حوالہ دیا ہے، آگے لکھتے ہیں کہ 1947ء میں ٹیٹوال میں متعین ایک فوجی افسر راجہ گلزار خان نے 1948ء میں اس دریا کا موجودہ نام نیلم تجویز کیا۔ پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کی حکومت نے 1957ء میں اس کا نوٹیفکیشن جاری کیا۔۱؎ (سہ ماہی شاردا 2009 صفحہ 164) ۲؎ تذکرہ نگار وادیٔ نیلم کے ایک گاؤں کو بھی اس کی وجہ بتاتے ہیں، جو قرین قیاس نہیں۔ (رشید فاروقی)۔ بعض تذکرہ نگار نیلم پتھر کی وجہ سے اس کا نام نیلم بتاتے ہیں۔ البتہ یہ بات طے ہے کہ 1957 میں امین گیلانی کی قرارداد پر اس کا نام کشن گنگا سے تبدیل کر کے 'نیلم' رکھنے کا نوٹیفکیشن جاری ہوا ہے۔ (رشید فاروقی)

دراوہ

وادیٔ نیلم کا قدیم نام دراوہ بھی تھا۔جس کا ذکر متعدد تواریخ ،سفرناموں اور تذکروں میں ہوا ہے۔اس سلسلے میں رشید فاروقی اپنی کتاب 'تاریخ ثقافت نیلم 'میں کیا لکھتے ہیں آیئے دیکھیں۔

''قدیم تاریخی کتب کے مطالعہ سے یہ بات وضح ہوتی ہے کہ 'دراوہ' کا جغرافیہ سکڑتا پھیلتا رہا۔کبھی یہاں چھوٹی چھوٹی ریاستیں، جو خود مختار تھیں، آباد رہیں۔کبھی کسی ایک حکمران کے ماتحت۔کبھی چین کی ذیلی ریاست کے طور پر۔تاہم لور دراوہ اور اپر دراوہ 1862/72 The Jammu and Kashmir , Territories چیلہانہ ٹیٹوال سے شاردا کے درمیان کا علاقہ دراوہ تحریر کیا ہے۔

میجر بیٹس کی کتاب گزیٹر آف کشمیر Gazzettier of Kashmir کے مطابق کرناہ تا تاؤبٹ کا علاقہ دراوہ کہلاتا ہے۔لور دراوہ کرناہ سے کیرن سریاں تک اپر دراوہ سریاں کیرن سے تاؤبٹ تک

لور دراوہ اپر دراوہ بلور اصغر بلور اکبر کے ناموں سے چین کی طفیلی ریاست بھی رہ چکے ہیں۔چینی سیاح Ah Oo-Oo-Oo Hue Ch Ado ہوئی چی

ایڈ واواواواواور البیرونی نے اس کی تائید کی ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

فاضل مصنف نے ملکۂ نور جہاں کو شاہجہاں کی بیوی لکھا ہے، جب کہ نور جہاں شاہجہاں کی ماں تھی ۲ یہ سہ ماہی مجلہ غالباً شاردا ہو سکتا ہے۔کیونکہ اس مجلّے میں راقم نے بھی اس حوالے سے ایک مضمون پڑھا ہے۔

'نویں صدی کے درمیان بلور اکبر کا حکمران تبت کے راجاؤں کے خوف سے بلور اصغر میں آکر چھپ گیا تھا۔شاردا کے اوپر کا علاقہ چلاس، بلتستان، کارگل، بلور اکبر گلگت، پشین، چترال بلور اصغر کہلاتے تھے۔شاردا جہاں لکڑی کا بہت بڑا بُت ہے۔ ۱ بلور کے دامن میں ہے۔مورّخ ڈبلیو، ڈبلیوٹارن کے مطابق یونانیوں کی 'باختری' سلطنت قائم ہونے کے بعد امودریا اور گنگا وادی کے درمیان بڑے پیمانے پر تجارت شروع ہوئی اس درمیان روم کا دینار، جسے کشمیر میں دیار کہا جاتا تھا، کشمیر میں متعارف ہوا۔دراوہ بھی کشمیر کے ماتحت کبھی خود مختار، کبھی بلور اصغر، کبھی بلور اکبر سلطنتوں کا حصہ رہا ہے۔کئی ادوار میں دراوہ اتنے پاور فُل حکمران رہے ہیں، جن سے لڑائیوں میں مدد بھی طلب کی گئی۔تفصیل راج ترنگنی شلوک نمبر 2842 میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔بہر حال بات جغرافیہ کی ہو رہی تھی۔اب وادیٔ نیلم کی حدود چلہانہ پار ۲ سے شروع ہوکر تاؤبٹ تک جاتی ہے۔

مورّخ اور محقق رشید شاہ فاروقی نے اپنے تحقیقی مقالے میں اس سرسبز شاداب اور زرخیز زمین میں پیدا ہونے والی اہم شخصیات کا بھی ذکر کیا۔وہ لکھتے ہیں کہ بیوروکریسی میں سیکریٹری ٹو دی گورنمنٹ اور فوج میں بریگیڈئر کے عہدوں سے سیاست میں ممبر اسمبلی سے وزیر تعلیم کے شعبے میں، پی، ایچ، ڈی کی اعلیٰ ڈگری

تک ، ڈاکٹر ، سپیشلسٹ ، انجینئر ، آرکی ٹیکٹ ، وکلاء ، جج کے عہدوں تک وادیٔ نیلم کے ذہین لوگ موجود ہیں۔ آج سے ہزاروں سال پہلے کسی دانا نے کہا تھا کہ وادیٔ نیلم کا ہر شخص پڑھا لکھا اور ذہین ہے۔ یہ 1947ء سے آج تک کی صورت حال ہے۔ 1947ء سے قبل بھی وادیٔ نیلم کو یہ فخر حاصل رہا ہے۔ کہ اس سے تعلق رکھنے والے مولانا محمد سعید مسعودی، مولانا غلام مصطفےٰ شاہ، میاں عبدالرشید کشمیر اسمبلی کے ممبر تھے۔ محدّث کشمیری مولانا انور شاہ ؒ برصغیر کی مشہور علمی و دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرّس رہے۔ ہزاروں سال قبل اس وادی میں شاردا یونیورسٹی جیسی مشہور علمی درسگاہ موجود تھی۔ جہاں ساری دنیا سے طالبان علم آ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس کی نظیر کشمیر کے دونوں حصوں میں کیا پورے برصغیر میں نہیں ملتی۔

۱ے کبھی تھا۔ لیکن آج ایسے کسی بت کا نام ونشان وہاں نہیں پایا جاتا۔

۲ے موجودہ شاردا پر ایک پڑاؤ۔

ایسے چند اعزازات جو صرف وادیٔ نیلم کو حاصل ہیں

۱۔ شاردا یونیورسٹی (پیٹھ) شاردا قلعہ، شاردا مندر۔

۲۔ شاردا لائبریری، جس میں ستر لاکھ کتابیں موجود تھیں۔

۳۔ چین وسط ایشیاء اور کشمیر کے درمیان گٹوے کا اعزاز۔

۴۔ ایک ہی وادی کے متحدہ کشمیر اسمبلی میں تین ایم، ایل، اے۔

۵۔ سب سے زیادہ زبان بندی و علاقہ بندی کے احکامات ڈوگرہ دور میں مولانا غلام مصطفےٰ شاہ کے خلاف جاری ہوئے۔

۶۔ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرّس ہونے کا اعزاز مولانا انور شاہ ؒ کے پاس۔

۷۔ بھارتی پارلیمنٹ میں بحالیٔ قوانین (مسلم پرسنل لا) پر سات گھنٹوں کی تقریر کا اعزاز مولانا مسعودی کو حاصل ہے۔

۸۔ وکرماتما دیوکر نام مصنف پنڈت بیس 1075ء کے مطابق شاردا وہ واحد مقام ہے، جہاں کا ہر شخص پڑھا لکھا ہے۔ یہ اعزاز برصغیر میں کسی اور کو حاصل نہیں۔

۹۔ پنڈتوں کے سب سے متبرک دریا کشن گنگا، سرسوتی، مدھومتی، سرسوتی جھیل وادیٔ نیلم میں ہیں۔

۱۰۔ اسلام سب سے پہلے نیلم میں پھیلا۔

۱۱۔ جمال الدین مدفون شاردا کے مزار پر برگد کا درخت ہے، اس نسل کا دوسرا درخت کشمیر میں ہے۔

۱ے آج کی تاریخ میں وہاں لکڑی کا کوئی بُت نہیں (راجہ نذر بونیاری)۔

۲ے چلیہانہ تک ضلع مظفر آباد کی حدود ہیں جب کہ اس کے آگے ضلع نیلم کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ چلیہانہ کے بالکل مخالف سمت میں دریائے نیلم کے پار 'ٹیٹوال' گاؤں ہے۔ جہاں سے آج کل ایل، او، سی پرمشن پر ہر دو اطراف سے لوگوں کا آنے جانے کا سلسلہ ہفتے میں ایک دفعہ ہوتا ہے۔ یہاں ایک جھولا پُل Suspension Bridge بھی تعمیر کیا گیا ہے۔ (رن ب)

۳ے مولانا محمد سعید مسعودی ایک چھوٹے سے گاؤں 'لوات' میں پیدا

ہوئے، جو دریائے نیلم کے کنارے پر شاہراہِ نیلم کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔

ہے ۔ بحوالہ تاریخ اولیائے نیلم 'ناگ سے نیلم تک' کتاب کے مصنف سمیع اللہ عزیز منہاس لکھتے ہیں کہ 'دراوہ' دردی زبان کا لفظ ہے، جو اصل میں دردا کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ دردا، یعنی دردوں کا علاقہ۔ قدیم سنسکرت لٹریچر میں اسے اسی نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ مہا بھارت میں کوروؤں اور پانڈوؤں کی جس مشہور زمانہ جنگ کا ذکر ملتا ہے، اُس میں ہمیں 'داراداس' اور 'دراوہ' کے نام بھی ملتے ہیں۔ یہ وہ ریاستیں تھیں، جنہوں نے کوروکھیشتر کی خونریز جنگ میں پانڈو کے ہیرو ارجن کا ساتھ دیا تھا۔ پنڈت رتن کول شاردا پر ایک تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں کہ دراوہ 958ء سے 1155ء تک ایک فیوڈل ریاست تھی، جہاں دیوراند (دراند) کا راجہ حکومت کرتا تھا۔ جس کے نام کی نسبت سے یہ علاقہ دراند کہلاتا تھا۔ اچھر چند شاہپوریہ قدیم جغرافیہ کشمیر میں وادئ کشن گنگا میں ایسی ہی ذیلی ریاستوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

'وادئ کشن گنگا' کا وہ حصہ جو دریائے کرناہ (قاضی ناگن نالہ) کے کشن گنگا کے اتصال کے اوپر واقع ہے 'شردی' (شاردا) تک جداگانہ طور پر دارد کہلاتا ہے۔ غالباً اسی لئے کلہن نے دراند کا لفظ استعمال کیا ہے۔ بالائی کشن گنگا اور اس کے معاون دریاؤں پر دردوں کی آبادیاں بجائے خود ایک علحدہ چھوٹی سی ریات کی صورت میں تھیں۔ جیسا کہ راج ترنگنی میں اُن کے لئے 'درد ویش' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس جگہ کے فرماں روا کے نام ہندوانہ ہوا کرتے تھے اور انہوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ کشمیر پر چڑھائی کی۔ ان لوگوں کے صدر مقام دت پور بمعنیٰ 'دردوں'

کا شہر تھا۔ وہ شاید اسی مقام پر واقع ہے، جہاں آج کل گریز ہے۔ دردوں کے نام سے کچھ اور علاقے بھی مشہور ہیں مثلاً دراس، درل، دارل، داور، اور دراوہ، یہ وہ نام ہیں جو دردوں کی آبادی کی وجہ سے ان علاقوں کو ملے۔ بالائی نیلم ویلی (گریز) میں داور اور زیرین نیلم ویلی میں درل (کنڈل شاہی) اس دور کی یادگار ہیں۔ خود نیلم ویلی میں موجود چلیہانہ سے لیکر کیل مچھل (مڑھل) تک کا علاقہ دراوہ کہلاتا ہے۔

گلگت ایجنسی سے ملنے والے مخطوطے اور آثار قدیمہ کے بعد جدید مؤرخین اب اس بات پر متفق ہوتے جارہے ہیں کہ دردوں کا مرکز اور پایہ تخت وادئ کشن گنگا ہی تھا۔ راج ترنگنی میں جہاں کشمیری بادشاہوں کے خلاف دردلشکر کی فتوحات کا ذکر ملتا ہے وہاں معروف مؤرخ اور سفیر ہیروڈوٹس نے بھی اپنی تاریخ میں اس بات کی تصدیق کی ہے۔ یونان کا مشہور تاریخ دان ہیروڈوٹس چوتھی صدی قبل مسیح میں گزرا ہے۔ یہ پہلا یونانی تاریخ دان ہے جس نے دردوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ دادیکائی لوگ (ہیروڈوٹس نے دردوں کے لئے دادیکائی کا لفظ استعمال کیا ہے، جو سنسکرت لٹریچر میں استعمال ہونے والے خط 'درادا' کی ایک یونانی شکل ہے)۔ ہندوستان کی شمالی سرحد پر آباد ہیں اور انتہائی جنگجو اور بہادر ہیں۔ سونے کی نکاسی اور تجارت میں ان کا بڑا رول رہا ہے۔ ہیروڈوٹس دراوہ کا جغرافیہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ 'درد' لوگ Kaspatyros (کشمیر) لے اور Pakytan (پکتیکیا) موجودہ افغانستان کا علاقہ ہے، کے درمیان آباد ہیں ۔ ہیروڈوٹس پہلا مورخ ہے جس نے دراوہ میں سونے کی نکاسی کرنے والے کان

کنوں کو سونا کھودنے والی چیونٹیوں سے تشبیہ دی ہے۔

ہیروڈوٹس لکھتا ہے ''ان کے علاوہ وہاں دیگر قبیلوں کے ہندوستانی 'درد' ہیں جو کشپیر (کشمیر) اور پکتیکیا (افغانستان) کی سرحد پر رہتے ہیں۔ یہ لوگ دیگر قبائل کی نسبت جنگجو ہیں اور ان میں سے بعض لوگ سونا لانے کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ اسی علاقے میں چونٹیاں ہوتی ہیں جو کہ کتے سے ذرا چھوٹی اور لومڑی سے ذرا بڑی ہوتی ہیں۔ یہ چونٹیاں زمین کے اندر بل بناتی ہیں اور یونانی چونٹیوں کی طرح سرنگ بنا کر مٹی کے ڈھیر باہر نکالتی ہے۔ اس میں سونا ہی سونا ہوتا ہے۔ دریائے نیلم اور دریائے سندھ سے بعد کے زمانے میں بھی سونا نکالا جاتا تھا۔ جس کا ذکر آئینِ اکبری میں بھی موجود ہے۔''

کلاڈیس ٹالمس (یونانی جغرافیہ دان اور ماہر ریاضی تھا۔ وہ مصر کے شہر اسکندریہ میں دوسری صدی عیسوی میں پروان چڑھا۔ اُس نے اپنی فلکیاتی اور جغرافیائی تجربے سے 1390ء میں منظر عام پر لائے۔ دراوہ کے متعلق ٹالمے لکھتا ہے کہ دردی (درد) سندھ نیلم) اور کشپیر یا ے (کشمیری) جہلم کے منبع پر رہتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دریائے نیلم کا ایک قدیم نام سندھوں دریا بھی ہے۔ اسٹائن جب انیسویں صدی میں شاردا مندر کی تلاش میں وادئ نیلم آیا تو اُس وقت بھی نیلم کو سندھوں دریا کہا جاتا تھا۔ اُس نے راج ترنگنی پر جو حاشیہ لکھا اس میں اُسے سندھو دریا کے نام سے ہی موسوم کیا ہے۔ ۱

دراوہ اور دردستان کا ذکر تاریخ دان سٹرابو (64 قبل مسیح سے 93 قبل مسیح تک) اور مورّخ پلینی (23 عیسوی سے 79 عیسوی) نے بھی دردوں اور اُن کے

وطن کا ذکر کیا ہے۔ ۲

ہوسکتا ہے کہ لداخ سے آنے والے دریائے سندھ کے نام کی نسبت سے جو اسی خطۂ ارضی سے ہوکر گزرتا ہے، کے بارے میں کسی مقامی ان پڑھ شخص نے مؤرخ (سفیر) کو غلط نام بتادیا ہو۔ کیونکہ کسی اور تاریخ میں اس کا ذکر نہیں۔

(رن ب)

۱ چک حکمرانوں کا ذکر جس تاریخ میں بھی ملتا ہے، اُس میں چکوں کو اِسی علاقہ یعنی گریز، دردستان یا دراوہ کے باشندے لکھا گیا ہے۔ تاریخ گلدستۂ کشمیر (مصنف ہرگوپال خستہ نے انہیں دیوؤں کی اولاد لکھا ہے۔ یوسف شاہ چک کو بھی دیو کی اولاد لکھا ہے، جس کی ماں کو گریز وادی سے کسی جن نے اغوا کر کے جنگل میں لے لیا۔ اس خاتون کو جو بچے ہوئے واپس آنے کے بعد پہلے اپنے علاقے پھر لولاب سوگام اور کپوارہ میں حکمران بنے۔ اور پھر سارے کشمیر پر قابض ہوگئے۔ (رن ب)۔ مصنف 'ناگ سے نیلم تک' سمیع اللہ عزیز منہاس نے دراوہ سے متعلق باب میں جن کتابوں سے حوالے پیش کئے ہیں، اُن میں...

۱۔ مہابھارت

۲۔ دردستاناز لیٹز

۳۔ راج ترنگنی

۴۔ یونانی دردی تاریخ دان وِکی پیڈ (رن ب)

ثقافت نیلم ودراوہ

'تاریخ ثقافت نیلم' مصنف رشید شاہ فاروقی سے کچھ اہم اقتباسات

دراوڑ:- ایک گروہ کا خیال ہے کہ دراوڑ میں دروڑ قوم آباد تھی۔قدیم آریہ نسل جو کہ دراوڑ کہلاتی تھی،اس نسبت سے اس علاقے کا نام دراوڑ پڑ گیا، کثرت استعمال کی وجہ سے دراوہ ہو گیا۔دراوڑ کے لفظی معنی دور سے آئے ہوئے لوگ۔

دریوا:- کچھ تذکرہ نگاروں کے مطابق آریا قوم نے اس علاقے میں ایک فصل 'دریوا' کاشت کی، جس کی وجہ سے اس علاقے کا نام دریوا پڑ گیا۔

دردا:- کچھ تذکرہ نگاروں کے مطابق شاردا کے شمال مغرب میں درد قوم آباد تھی۔جس کی نسبت سے اس علاقے کا نام درد پڑ گیا۔ کثرت استعمال کی وجہ سے 'دراوہ' ہو گیا۔

دردستان:- کچھ تذکروں کے مطاب درد آریائی نسل ہے۔جو اسکردو چلاس

میں مقیم ہے۔زمانۂ قدیم میں یہ علاقہ 'دردستان' یا 'رددیشیا' کے نام سے جانا جاتا تھا۔اسی دردقوم کا ایک حکمران، دوڑا بالائی علاقہ دراوہ پر حکومت کرتا تھا۔دردستان اور دعیشیا نام پڑنے اور کثرت استعمال سے یہ 'دراوہ' ہو گیا۔

درنڈہ:- تذکرنگاروں کے مطابق دردقوم کے راجہ درنڈا کے نام کی نسبت سے اس علاقہ کا نام درنڈا تھا، جو کثرت استعمال کی وجہ سے 'دراوہ' پڑ گیا۔ پنڈت رتن کول کے مطابق اپر دراوہ (بالائی کشن گنگا) پر دردقوم کا ایک حکمران (راجہ) دورنڈا حکومت کرتا تھا۔[1]

درآوہ:- بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق 'در' فارسی میں نیکی بھلائی اور اچھے کاموں کو کہا جاتا ہے، جب کہ آوہ کمہار کی بھٹی کو کہتے ہیں۔بیرونِ ممالک سے (بدھ دور میں) یہاں عبادت و ریاضت کرتے اور گناہوں سے پاک ہو کر واپس جاتے۔اسی نسبت سے اسے درآوہ کہا جاتا تھا[2]۔ جنوبی ہند کی ریاست تامل ناڈو اور شری لنکا میں دراوڑ نسل کے لوگ آج بھی آباد ہیں۔

[1] 'درنڈہ' پہاڑی زبان میں 'دیوار'، 'باڑ'، رکاوٹ، باندھ کو بھی کہا جاتا ہے، چونکہ 'دراوہ' (سلسلۂ کوہستان) قلمروئے کشمیر شمال مغرب کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں، آفاتِ سماوی وغیرہ کے لئے ایک مضبوط ناقابلِ تسخیر دیوار کا کام دیتے تھے۔اس لئے سارے علاقے کو 'درنڈہ' کہا جاتا رہا ہے۔(راجہ نذر بونیاری)

[2] 'در' فارسی میں دروازہ کو کہتے ہیں۔یہ علاقہ چین، روس اور وسط ایشیا کے لوگوں کیلئے جنوبی ایشیاء میں وارد ہونے کے لئے ایک آسان راستہ اور دروازے کا

کام دیتا رہا ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ 'درانداز' یا در آنا...... یا پھر 'آوے' کا راستہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا رہا ہو۔ 'آوہ' پہاڑی میں آنے کو کہتے ہیں۔ (راجہ نذر بونیاری)

(در آوہ) اندر آنے کو بھی کہتے ہیں (ر،ن،ب)

دراول:- پرانے زمانے میں راجہ دامودر اول کشمیر پر حکمرانی کرتا تھا۔ جس کے نام کی نسبت سے اس علاقہ کا نام 'دراوہ' پڑا جو بگڑتے بگڑتے دراوہ بن گیا۔ (مظفر آباد صفحہ 26، ماہ نامہ شمس بری اگست 2000ء 'شیرازہ' سرینگر جلد 43 صفحہ 261، تاریخ جموں)

درد:- مہابھارت میں دراوہ کا نام 'درد' درج تھا۔ جو بعد میں دراوہ ہو گیا۔ (بحوالہ کرالہ راجپوت) صفحہ 8.5 تاریخ بدتیح ہندوستان صفحہ نمبر 560 رسالہ شمس بری صفحہ نمبر ۱۰۰ اشارہ پانچ اگست 2000ء

ڈراوہ (DRAVO):- مسٹر ڈریو جو مشہور سفیر اور تاریخی محقق اور جغرافیہ دان تھا، اپنی کتاب Kashmir The Jammu Territories میں رقمطراز ہے کہ اس علاقہ کا قدیم نام 'Dravo' تھا، جو بعد میں دراوہ کے نام سے مشہور ہوگیا۔

قبائل

رشید فاروقی نے اپنی تحقیق میں اس علاقہ میں آباد قدیم قبائل اور قوموں ذاتوں اور فرقوں کا ذکر کیا ہے۔ اُن میں نہ تو ساری متذکرہ قومیں ذاتیں ہیں نہ قبائل۔ قبائل کا تصور قوموں اور ذاتوں سے مختلف ہوتا ہے۔ 'ناگ' اور 'پشاچ' دو الفاظ پورے قلمروئے کشمیر کی تواریخ اور تذکروں میں چھائے ہوئے ہیں۔ ایک بات طے ہے کہ وادی کے گرد ونواح کے پہاڑی علاقوں، گزرگاہوں اور درّوں میں 'ناگ' اور میدانی علاقوں میں 'پشاچ' کثرت سے آباد رہے ہیں۔ (راجہ نذر بونیاری)

رشید فاروقی نے جن قبائل کا ذکر 'نیل مت پُران'، 'تاریخ مظفر آباد' (کشور کاشمیر) وغیرہ تحقیقی کتب و مقالہ جات کے حوالہ سے کیا ہے۔ (اُن میں ،ناگ، منڈا، دراوڑِ ڈگر، ڈوگرے، پشاء (پچھ) اور تانترے وغیرہ شامل ہیں) لے

[1] راج ترنگنی میں......آریا۔بومب، کھش ،اورناگوں کا ذکر آتا ہے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لوگ لاکھوں کی تعداد میں ان جنگلوں، گھاٹیوں اور دریاؤں کے کناروں پر آباد تھے۔انہیں وحشی قبائل بھی لکھا گیا ہے۔بیرونی سفرا اور سیاحوں نے انہیں وحشی لکھا کیونکہ ان کا خیال ہے کہ یہ قبائل وادی میں آنے اور باہر جانے والی گذرگاہوں پر آنے جانے والے مہذّب سیاحوں، تاجروں اور حملہ آوروں کو لوٹ لیتے تھے اور اُن کو قتل بھی کر دیتے تھے اور یہی اُن کا ذریعہ معاش تھا۔اسی حوالے سے راقم الحروف نے اپنے کئی مقالوں میں اس اہم بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان قبائل نے صرف اُن لوگوں کو لوٹا اور قتل کیا ہے جو بُری نیت سے وادی میں آتے تھے۔ان قبائل نے ہر اُس فرد یا افراد کی وادی میں داخلے میں مدد کی ہے جو کسی اہم فریضے (مذہبی تبلیغ و پرچار یا اصلاح) کے لئے آتے تھے۔'دراوہ' میں مقیم قبائل نے شمال مشرق اور مشرق بعید سے آنے والے بودھ پرچارکوں اور بھکشوؤں کو اپنے علاقے میں آنے کی مدد کی اور اُن کا استقبال کیا، جس کے نتیجے میں 'شاردا' یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔(راجہ نذر بونیاری)۔

راقم نے نیلم وادی کے وسط میں واقع ایک چھوٹی سی بستی کا ذکر اسی مقالے میں کیا ہے، جہاں کے باسی کوئی اجنبی سے بولی بولتے ہیں۔صرف چند کُنبے ہیں ،جنہیں خود بھی معلوم نہیں کہ اُن کی بولی کا کیا نام ہے۔مقامی لوگ اُنہیں 'اراڈی' ،'ڈردائی' وغیرہ بولتے ہیں۔لیکن دردستان اور کافرستان کی تواریخ پڑھنے کے بعد میں نے اندازہ لگایا کہ دراصل یہ بولی دردی اور کافرستان اور پہاڑی کی ایک آمیزش ہے۔کیونکہ خدوخال کی وجہ سے بھی یہ لوگ 'کافر' یا درد لگتے ہیں۔ان کی

شناخت کچھ گُم سی ہو کر رہ گئی ہے[1]

[1] وادیٔ نیلم میں بولی جانے والی کوئی بھی بولی یا زبان ہو اُس میں فارسی سنسکرت، یونانی، ترکی، عربی، منگول زبانوں کے الفاظ کی بہتات ہے۔خصوصاً بر صغیر میں اسلام کی آمد اور اس کے بعد کے ادوار میں علماء اور مبلغین کی آمد سے عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ یہاں کی سب مقامی زبانوں میں آ کے شامل ہوتے رہے ہیں۔اس علاقہ میں سالخلہ، میرپور، اٹھمقام، لوات، اور کیل کے دیہات اور قصبہ جات میں کئی قبریں ''نوگز قبراں' کہلاتی ہیں۔کہا جاتا ہے کہ یہ قبریں عرب مجاہدین اور صحابہ کرامؓ کی ہیں۔لیکن ان کے بارے میں کوئی تحریری شہادت اور ثبوت موجود نہیں ہیں۔روایتیں سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں۔اس علاقے میں 'د' سے شروع ہونے والے یہ دیہات ہیں ۔جیسے دیامر، داور، دواریاں، دراس، دراوہ، دادرا، درل۔اگر باریک بینی سے غور کیا جائے تو نتیجہ یہ اخذ ہوتا ہے کہ اصل میں دیامر سے بارہ مولہ اور کنڈل شاہی سے مظفرآباد تک کا تمام علاقہ ایک زمانے میں 'درل' کہلاتا تھا اور اس کا مرکز موجودہ کنڈل شاہی میں تھا۔ہمارے اس موقف کی تائید سفر نامہ ہیون سانگ سے ہوتی ہے جو چھٹی صدی عیسوی میں لکھا گیا ہے[2]

اس ضلع کی مجموعی آبادی دو لاکھ کے قریب ہے۔اور پہاڑی زبان بولنے والے ۸۰ فی صد دردی، ۲ فیصد کشمیری ۱۲ فیصد گوجری اور ۲ فیصد اور دوسری بولیاں (شینا، پشتو، راوڈی ۴ فیصد)۔(راجہ نذر بونیاری)

وادیٔ نیلم کا لوک ادب

برصغیر خصوصاً پنجاب میں جو درجہ ہیر رانجھا، شیرین فرہاد، لیلیٰ مجنوں، سسی پنوں، سوہنی مہوال، مرزا صاحباں اور سیف الملوک جیسی لوک گیتوں اور مثنویوں کو حاصل ہے وہی درجہ وادیٔ نیلم میں مقامی عشقیہ لوک گیت 'قینچی' کو حاصل ہے۔
ریاست جموں و کشمیر میں جن علاقوں میں پہاڑی زبان بولنے والے رہتے ہیں، وہاں بھی قینچی کو مساوی پذیرائی حاصل ہے۔ اور آج بھی پہاڑی نوجوان زبانی یا سازوں خصوصاً (مخصوص پہاڑی موسیقی کے آلہ بنسری) کے ذریعے قینچی اپنی مخصوص طرز اور لے میں گاتے اور بجاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ وادیٔ نیلم کے میر پورہ اور فلاں کاں کے درمیاں ایک نالہ آتا ہے۔ اس کے اوپر تاحد نظر ایک وسیع و عریض علاقے میں ایک گھنا جنگل پھیلا ہوا ہے۔ جس کا نام درشی ہے۔ ڈوگرہ دور میں اس جنگل سے لکڑی کی نکاسی کا ٹھیکہ گنڈا سنگھ نامی ایک فرم کو ملا۔ اس ٹھکیدار نے ایک منشی (کلرک) تعینات کر رکھا تھا، جس کا نام ضیاء الدین تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا نام غلام ربانی تھا۔ اس جنگل میں

ایک مقامی لڑکی بخت نور مال مویشی چرایا کرتی تھی، جو پرنی گاؤں کی تھی۔ اُس کو اس منشی کے ساتھ دوستی ہوگئی جو عشق کی آخری حدوں کو چھونے لگی۔ اس کا چرچا گاؤں گاؤں ہونے لگا۔ راجہ بشیر ڈپٹی ڈائیریکٹر کے والد نے منشی کو اتنا مارا کہ وہ لہو لہان ہوگیا۔ اُسے اٹھا کر علاج و معالجہ کے لئے کرناہ لے گئے۔ تھانہ پولیس ٹیٹوال میں پولیس کیس درج ہوا۔ منشی کی غیر حاضری کے نتیجے میں عاشق اور معشوق کے ہجر میں یہ قینچی معرضِ وجود میں آئی۔ اس عورت کو جاننے اور دیکھنے والے آج بھی بقیدِ حیات ہیں۔ قینچی کسی شاعر کا کلام نہیں، معشوق کے دل سے نکلی ہوئی فریاد ہے۔ جو تین بندوں پر مشتمل ہے۔ ملاحظہ ہو۔

قینچی

درشی دے بنیاں بچ لا نید نا مالے   جُلیا مہاڑا منشی اللہ دے حوالے
لگی قینچی دلا دی اللہ دل ڈاہڈا تنگ ہے   گولی مار ورا کھیاں کی، اللہ مہاڑے سنگ اے
او لگی قینچی دلا دی

درشی دے بنیاں بچ چھک دیاں آری   دوڑ دوڑ میں تھکیاں توڑی موٹر کس کاری
لگی قینچی دلا دی

لگی قینچی دلا دی تا دل دیندا حولے   میں اڑیکاں نبڑاں وچ منشی بارا مولے
لگی قینچی دلا دی

لگی قینچی دلا دی اللہ دل ماہڑا ہاریا بانواں ٹُرٹن   اُنہاں دیاں جناں منشی کو ماریا
لگی قینچی دلا دی

ا پرانے لوگوں نے بتایا کہ یہ عورت تقریباً ۱۰۰ سال کی عمر میں فوت ہوئی۔

ا تاریخِ ثقافت نیلم (رشید شاہ فاروقی) گیزیٹر آف کشمیر

بیٹس Bates

ا مذکورہ گاؤں کے لوگ کس نسل یا قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں، اُس کا ذکر نہ کسی تاریخی دستاویز میں ملتا ہے اور نہ ریونیو ریکارڈ میں۔ راقم نے ان کے بارے میں کچھ مقامی لوگوں کے خیالات جاننے کی کوشش کی۔ ایک بزرگ نے کہا کہ یہ لوگ یہاں کے پشتنی باشندے نہیں۔ کہتے ہیں کہ یہاں ایک کھتری کنبہ رہتا تھا۔ جو اس علاقہ کا واحد (تاجر سیٹھ یا مہاجن تھا) ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ کھتری دکاندار کو راوڑا یا شاہ کہتے تھے (یہ بھی ہوسکتا ہے) پٹھان بھی ..... پٹھان کو رُاوڑا کہتے ہیں جو دکانداری یا بزنس کرتا ہو، جو نیچ ذات کا پٹھان مانا جاتا ہے۔ اُن کی زبان بازاری قسم کی ہوتی ہے۔ ۲

کُکُو

کُکُو ایک سیلانی (مہاجر) پرندہ ہے۔ یہ سال میں گیارہ مہینے مختلف علاقوں میں سیر سپاٹا کرتا رہتا ہے۔ کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں یہ بیساکھ کے مہینے میں آتا ہے اور اپنی خوبصورت میٹھی آواز میں لوگوں کے دلوں کو لبھا کر چلا جاتا ہے۔ کُکُو بھی وادیٔ نیلم کا ایک مقبول لوک گیت ہے، ملاحظہ ہو۔

کُکُو ادے باغا نچ گھڑ دیاں قلماں تُساں لایاں زخماں تے اللہ لاسی ملماں
کُکُو اسیلانیاں بول پردیسیا کُکُو وا بول

ہے (راجہ نذر بونیاری)

ڈھول سپاہی

یہ بھی علاقۂ نیلم کا مشہور گیت ہے۔ اس کا پسِ منظر یہ ہے کہ ایک سہیلی دوسری سہیلی کو کہتی ہے ''چلو گھاس لکڑیاں لے آئیں'' وہ کہتی ہے ''میرا ڈھول سپاہی رات کو چھٹی پر گھر پہنچا ہے، میں اُس کے ساتھ گپ شپ کروں گی''۔

اگ لاواں ٹیراں کو راتیں مہاڑا سپاہی آیا
صبح جُلساں سیرا کو دوھ دا بھر ڈولا
چُھٹی کہن کے آ ڈھولا کوئی کاغذ دا گتہ نی
اک واری آ کے مل ٹھولا زندگی دا پتہ نی

بالا کونجڑیئے

کونج ایک پرندے کو کہتے ہیں جو آبی پرندہ ہوتا ہے اور ہر سال سائبیریا، یا قطبِ شمالی کے کسی علاقے سے اُڑ کر کشمیر میں آجاتا ہے۔ اُردو میں اسے مرغابی کہتے ہیں۔

کونج:- اس پرندے کے ہر سال طویل سفر کرنے اور جھنڈ میں آنے اور جانے سے متاثر ہو کر یہ گیت موزون ہو گیا ہے۔

اُڈ بالا کونجڑیئے اگ بلدی سیکن دے
رب تینوں حسن دتا ذرا رج کے ویکھن دے
اُڈ بالا کونجڑیئے گڈی اندی کو رنگ لاواں
اُچی ماہلی تہ بہہ کے سجناں دے گراں دی چنگ لاواں
اُڈ بالا کونجڑیئے مانسہرے اگا تھپ لگدی

وار ھندکو

1846ء میں معاہدہ امرتسر کے خلاف ریاست میں جابجا علمِ بغاوت بلند کیا گیا۔ مقامی جاگیردار راجہ شیر احمد خان نے بھی ڈوگرہ حکمران کے ساتھ پنجہ آزمائی کی۔ جس میں ڈوگرہ حکمران لکھپت رائے مارا گیا۔ اس واقعے سے رزمیہ نظم مقبول ہے۔

واہ واہ شیر احمد خانا تکُو اللہ آپ بنایا
رب رسولؐ والا تُو ہڑے اُتے آیا سایہ
شہر کشمیر لواسی نالے بوئی تا کٹھائی

وادئ نیلم میں پہاڑی زبان کے دوسرے لوک گیت جیسے ماہیا، بالو، چن، دی جوڑی بھی گائے جاتے ہیں۔ شادی بیاہ کے لوک گیت عام لوگ اور خواص سب گاتے ہیں۔ کشمیری 'روف' اور 'ونہ وُن' 1971ء تک خواتین گاتی تھیں۔ اب یہ

ساری چیزیں خواب بنتی جا رہی ہیں۔ شمشیر بازی، گتکہ، اور دوسرے مردانہ رقص بدستور ہیں۔ ۲

۱ ثقافت نیلم
۲ (رن ب)

۱ لواسی، بوئی اور کھٹائی سلاطینِ بمبہ کی جاگیریں تھیں۔

میرا مطالعہ اور مشاہدہ

دردوں، دردستان اور دراوہ سے متعلق مؤرخین کی آراء سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ ان عظیم شخصیات، علماء سفرا اور محققین نے جن نامساعد حالات میں ایسے علاقوں کا سفر کیا، جہاں پرندے بھی جانے سے گھبراتے تھے۔ ان لوگوں نے اپنی زبانوں اور رسم الخط میں مقامات کا جہاں ذکر کیا ہے، وہاں املا کی غلطیوں اور صحیح تلفظ دستیاب نہ ہونے کے سبب کچھ کا املا غلط ہو جانے سے ناموں میں غلطیاں ہوسکتی ہیں۔ اور ایک کتاب سے دوسری اور پھر تیسری چوتھی میں جب یہ الفاظ دہرائے یا لکھے جاتے ہیں تو ان میں تبدیلی آجانا ناگزیر ہوتا ہے، وہ بھی صدیوں تک مستعمل رہتے ہوئے۔ ایسی ہزاروں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ اقوام کی پہچان یا شناخت اُن کی سماجی، ثقافتی اور تہذیبی زندگی سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن اُن کی جسمانی ساخت، قد و کاٹھ، خد و خال بھی سماجی میل جول اور اختلاطِ نسل سے بدل جاتے ہیں۔ جہاں تک 'دراوہ' یا نیلم وادی میں بسنے والے قبائل کا تعلق ہے، اُن

کے Anthropological Feartures سو فیصدی ایک جیسے ہیں، لیکن جوں ہی آپ کیل سے شمال کی جانب بڑھیں گے تو تاؤبٹ سے آگے قبائل کے جسمانی خدوخال چہرے کی بناوٹ میں صاف تبدیلی واقع ہوتی جائے گی۔گلگت، بلتستان، کرگل، دراس، چلاس اسکردو اور چترال کے لوگوں کی شکل وصورت منگول یا چین سے مشابہت رکھتی ہوئی محسوس ہوگی۔اور یہی فیچرس پورے شمالی خطے، لداخ، تبت، چین، نیپال، سکم، بھوٹان، برما، انڈونیشیاء، ملائیشیا، سنگاپور، ہانگ کانگ بلکہ وسط ایشیاء کے چند ممالک میں بھی دیکھنے کو ملیں گے۔ان لوگوں کی آنکھیں کُرنجی اور ناک کہیں چپٹی، درمیانہ، چھوٹی اور کہیں نہ ہونے کے برابر۔سماجی اختلاط ،شادی بیاہ اور آپسی میل ملاپ کے بعد اب متذکرہ بالا اقوام اور قبائل کی شناخت (علاقائی) اعتبار سے مشکل سے ہوتی ہے۔

وادیٔ نیلم نیز 'دراوہ' کے دوسو چوبیس دیہات اور پرگنہ جات کے لوگوں کے جسمانی خدوخال سے یہ لوگ ایک ہی نسل سے تعلق رکھنے والے لگتے ہیں۔اس نسلی اکائی میں بلاشبہ کئی ذاتوں اور قبائل کے لوگ شامل ہیں اور تقریباً آدھ درجن بولیاں بولنے والے اس پورے خطے میں آباد ہیں۔

نسلی اکائی ایک اور لسانی اکائیاں کئی

یہ کثرت میں وحدت کی ایک زندہ مثال ہے۔دردی، شینا، کشمیری، پہاڑی ،گوجری اس علاقے کی خاص زبانیں ہیں، جن کا لٹریچر بھی دستیاب ہے۔'نیلم وادی' کے ایک گاؤں میں جو کہیں اٹھمقام کے آس پاس ہے میں دس بارہ کنبے آباد ہیں۔یہ لوگ ایک بالکل الگ اجنبی سی بولی بولتے ہیں، جس کا فی الوقت کوئی نام نہیں۔لیکن جو لوگ وہاں رہتے ہیں وہ اُنہیں 'دراوڑی' کہتے ہیں۔آپس میں یہ لوگ اپنی بولی بولتے ہیں۔لیکن باقی دیہات کے لوگوں کے ساتھ پہاڑی میں بات کرتے ہیں۔ان کے پاس اپنی نسل قوم یا قبیلے کی کوئی تاریخ نہیں۔مقامی ماہرین لسانیات بھی ان کی بولی کو کوئی نام دینے سے قاصر ہیں۔خدوخال سے نیلم اور دراوہ کے لوگ آرین ہیں۔انتہائی شمال کی جانب بسنے والوں میں اپنی نسل کے تئیں 'بھٹے' ہونے کے خدشات ہیں۔بامزئی، خستہ، فوق اور مولوی حشمت اللہ خان نے بھی اُنہیں 'بُھٹہ' لکھا ہے۔اصل میں کشمیر میں 'بھوٹہ' یا 'بُھٹہ' چینی یا لداخی خد

وضع قطع رکھنے والوں کو کہتے ہیں، جن کی آنکھیں کرنجی اور ناک 'منی' ہوتی ہے اس نسل کے لوگوں کے کچھ کنبے سرینگر اور بانڈی پورہ میں بھی رہتے ہیں۔

وادیٔ نیلم یوں تو کشمیر کا ایک حصہ صدیوں سے رہی ہے۔ شمالی کشمیر یا پرگنہ کامراج (کمراز) کے لوگ بڑی تعداد میں ہجرت کر کے اس وادی میں جا کر بس گئے۔ کیونکہ وادی میں داخلی انتشار بیرونی حملوں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور راج واڑوں کے حکمرانوں کے درمیان بے مقصد جنگیں معمول بن کر رہ گئیں تھیں ۔لوگ سمجھتے تھے کہ وادیٔ کشن گنگا اور دراوہ کے علاقے ہی اُن کے لئے محفوظ پناہ گاہ ہو سکتے ہیں۔ جہاں سے اس خطہ کو چھوڑ کر وہ چاہیں تو ہندوستان سے باہر وسط ایشیاء، ایران، ترکی، عرب وغیرہ ممالک میں تجارت یا روزگار کے لئے جا سکتے ہیں۔

کشمیر کی جملہ تواریخ میں اس قلمرو میں رہنے والوں کو ناگ اور پشاچ لکھا گیا ہے۔ ناگ لفظ سانپ یا چشمہ کیلئے پشاجی (کشمیری) زبان میں استعمال ہوتا اور پشاچ کچا گوشت کھانے والے کے لئے سنسکرت اور قدیم پراکرتی زبان میں استعمال ہوا ہے۔ ناگ ہوں یا پشاچ یہ لوگ وادی کے اندر (پشاچ) اور وادی کے باہر پہاڑوں میں (ناگ) رہتے تھے۔ ناگ اگر سانپ کے معنوں میں لیا جائے تو یہ زیادہ قرین قیاس اور سچ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ سانپوں کی طرح بلوں ، سوراخوں، گپھاؤں اور غاروں میں مسکن پذیر ہوتے تھے۔ سانپوں کی طرح چٹانوں اور پتھروں کی اوٹ میں چھپ جاتے۔ جب ضرورت پڑتی تو ان پناہ گاہوں سے باہر نکل کر بیرونی حملہ آوروں اور مسافروں پر حملہ کر دیتے۔ اُن سے

کھانے پینے کی اشیاء لوٹ لیتے اور پھر دراڑوں میں جا چھپتے۔ ایک بات جس پر تمام مؤرخین متفق ہیں کہ وادی سے باہر ہجرت کرنے والوں کو یہ کبھی تکلیف نہ دیتے، بلکہ ان خوفناک اور پُر خطر گزرگاہوں اور گھاٹیوں میں ان کی رہنمائی اور مدد کرتے اور انہیں اُن کی مطلوبہ یا بستی مقام تک چھوڑ آتے اور بیرونی ملکوں سے آنے والوں کی نیت کا اندازہ کر کے ہی اُن کے ساتھ برتاؤ کرتے۔ حملہ آوروں اور بُری نیت سے آنے والوں پر حملہ کر کے لوٹ لیتے یا ہلاک کر ڈالتے۔ ناگ اور پشاچ مزاجاً اور طبیعتاً الگ الگ اقوام اور قبائل مانے جاتے رہے ہیں۔ حالات نے پشاجوں کو Defensive یعنی جب کہ ناگاؤں یا ناگوں کو Offensive بنا دیا تھا۔ وادی کے اندر کے لوگوں نے حالات اور مقدر سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اس لئے جب کبھی بھی کوئی حملہ آور وادی میں وارد ہوتا تو لوگ اُس کا استقبال کرتے اور درخواست کرتے کہ وہ تا حیات اُن کی اطاعت اور تابع داری کرتے رہیں گے۔ لیکن وہ انہیں اس پیاری بہشت سے نہ نکالیں۔ پرانی کہاوت ہے کہ وقت وقت کو کھاتا ہے۔ ہر دن طلوع ہونے والا سورج ایک نئے انقلاب کو جنم دیتا ہے۔ آج سے پچاس سال پہلے اور آج کے کشمیر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وادی میں سو فیصد لکڑی کے Structure (عارضی رہائشی ڈھانچے) اب داستانِ پارینہ کی چیزیں بن گئی ہیں۔

'تاریخِ ثقافت نیلم' میں لکھا ہے کہ 1975ء تک وادی تا کاغان تک وہی پرانے طرز کے کوٹھے اور کوچھیاں تھیں جن میں لوگ برف اور شدید سردی سے بچنے کے لئے رہتے تھے۔ گرم اور اونی کپڑے سال بھر پہنتے تھے۔ پتلون اور کوٹ

یہاں 1975ء کے بعد ہی متعارف ہوئے۔ لوگ اپنے گھروں کا اناج اور خودرو سبزیاں کھاتے، سرما میں سوکھی جنگلی سبزیاں کھاتے۔ خواندگی کی شرح ستّر 70 کی دہائی میں بڑھ گئی۔ بہر حال اس موضوع پر ایک الگ ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ راقم الحروف نے نیلم کی ہر قدرتی اور نیلم واسیوں کے ہاتھوں سے بنی ہوئی چیزوں کا بغور مشاہدہ کیا۔ آج بھی اس وادی کے ندی نالوں پر گھراٹ (جندر) یا پن چکی سسٹم دیکھا۔ دھان سے چاول نکالنے کی مشینیں دیکھیں۔ پرانے طرز کے مکانات اور کوچھیاں اور سو فیصدی لکڑی کی شہتیروں سے بنے کوٹھار بھی دیکھے۔ کچھ کوٹھاروں اور کنکریٹ دکانوں میں لاہور، ایبٹ آباد اور اسلام آباد کے علاوہ گلگت، اسکردو میڈان چینا چیزیں (حتیٰ کہ اشیائے خوردونوش) بھی دیکھیں۔ آلاتِ کشاورزی وہی پرانی طرز کے ہیں۔ فیشن وبائی بیماری کی طرح ہوا کے ساتھ پھیلتا ہے۔ اور لباس اور گفتگو پر بیرونی تہذیبی یلغار بھی صاف نظر آ رہی ہے۔ فی الوقت پہاڑی اور کشمیری تہذیب کا خوبصورت اتصال ہر جگہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔

دونوں تہذیبی اکائیوں کا سماجی اور تہذیبی میل جول قابلِ تقلید و تعریف ہے۔ مجھے 2000ء کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ جب میرپور میں قائم 'قلب و قلم انٹرنیشنل' نامی ایک غیر سیاسی اور ثقافتی تنظیم نے میرے اعزاز میں ایک مقامی ہوٹل میں ایک عشائیے کا انتظام کیا تھا۔ جس میں میرپور کی زرخیز سرزمین سے تعلق رکھنے والی کچھ اہم شخصیات (مرد و خواتین) کے علاوہ میڈیا کے حضرات بھی موجود تھے۔ ان شخصیات میں پروفیسر نصر اللہ خان ناصر (مؤرخ، ادیب اور محقق)،

شوکت مجید ملک سیکریٹری کمشنر اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آزاد کشمیر، ناز انصاری ولد عبد الخالق انصاری صدر جموں و کشمیر محاذ رائے شماری، مقامی کالجوں کے پرنسپل، استاد، وکلاء اور ادیب و پرنٹ و برقی ابلاغ عامہ کے حضرات قابل ذکر ہیں۔ نشست کے آغاز میں تلاوت کلام پاک اور نعتیہ کلام کی Recitation تلاوت کے بعد ایک سترہ اٹھارہ سال کے لڑکے کو ڈائس پر بلایا گیا۔ اور اُسے کوئی کشمیری گانا سنانے کی فرمائش کی۔ اس لڑکے نے بے حد پُرسوز اور درد بھری آواز میں کشمیری کلام گایا، جس کے بول تھے۔

''کریو منزِ جگرس جائے، چھم نوؤ مائے مشائنی''

(ترجمہ: میں اپنے کلیجے میں تجھے جگہ دوں۔ میں تجھے نہیں بھول سکتا میرے وطن)۔

میں دیکھ رہا تھا کہ وہاں کچھ مہاجر نوجوان اور ایک معمر خاتون جذباتی ہو گئے تھے اور اُن کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔ میں اس لڑکے سے ملا اور پوچھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے ''میں اٹھمقام نیلم سے آیا ہوں۔ میں خواجہ خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ آج اس وادی میں کشمیری تمدن اور کلچر کو زندہ رکھنے والا کوئی نہیں ......دو تین Legend چند سال پہلے تک بقید حیات تھے جو کبھی کبھار آزاد کشمیر ریڈیو پر آ کر ایک آدھ گانا یا 'بیت' گا کر وہاں سکونت پذیر کشمیریوں کے شوق کی آبیاری کرتے تھے۔ اب وہاں بالی وڈ فلموں کے گیت سنے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں کشمیر اکاڈمی مظفر آباد کا رول مایوس کن ہے۔'' میں نے ایک نوجوان مظفر خان

سے پوچھا کہ کیا آپ لوگ 'سیف الملوک' 'کگو'، 'قینچی' اور 'وار شیر احمد خان' وغیرہ گاتے ہیں، تو اُس نے مایوس کُن لہجے میں کہا، ''مجھے پتہ نہیں۔ یہاں سیف نام کا ایک ڈرائیور ہے، اُس سے پوچھوں گا''۔

گورنمنٹ ڈگری کالج 'شاردا' کے ایک اُستاد پروفیسر وقار، جو ہیں تو اقتصادیات کے اُستاد لیکن ادب سے خاصا شغف رکھتے ہیں۔ مجھے کہا کہ اب شادی بیاہ کے موقعوں پر بھی خواتین کا گیت وغیرہ گانا عیب اور خلافِ شریعت سمجھا جانے لگا ہے۔ جس سے مجمع میّت جنازے کے جلوس اور برات میں فرق ہی محسوس نہیں ہوتا، لیکن شاہراہ سے ہٹ کر دور دور کے دیہات میں کہیں کہیں تہذیبی روایات زندہ ہیں۔ شاہ راہ نیلم پر سفر کے دوران میں نے دیکھا کہ مقامی مرد اور خواتین کاپوں میں گھاس کاٹ رہے ہیں۔ خواتین نے دوپٹوں کو پگڑیوں کی طرح سر سے لپیٹ رکھا ہے۔ جس سے اُن کے دراز گیسو بھی ڈھانپے ہوئے ہیں۔ طلباء و طالبات کو اپنے اپنے تعلیمی اداروں کی مقرر کی گئی وردی میں آتے جاتے دیکھا۔ سڑک پر سینکڑوں چھوٹی بڑی گاڑیاں (بسیں اور لکژری کوچز) چل رہی تھیں۔ جن میں مسافر کھچا کھچ بھرے رہتے ہیں۔ سڑکوں کی حالت اطمینان بخش ہے، لیکن شدید اور لگا تار بارشوں سے پسیاں 'سلائڈس' آ جاتی ہیں۔ جنگلات میں بھی تعمیرات دیکھ کر حیرانگی ہوئی۔ پروفیسر میر جو ہمارے ہمراہ شاردا یونیورسٹی کے مکمل مشاہدے تک رہے نے شاردا کے گردونواح کے مذہبی اور سیاحتی مقامات دُور سے ہی سہی، لیکن دکھائے۔ وادیٔ نیلم جیسے کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں، درجنوں وادیوں کی سرزمین ہے۔ ایک مشہور ویلی کا نام شونٹھر ویلی ہے۔ اس کے عقب میں

کشمیر کا سب سے اونچا پہاڑ ہے۔ یہ سطح سمندر سے 20700 فٹ اونچا ہے اور اس کا نام ہری پربت ہے (نانگا پربت کی اونچائی 26680 فٹ ہے جو اس کے پیچھے ہے۔ اور اس کے ساتھ سب سے اونچی K2 ہے۔ میر صاحب نے بتایا کہ ہری پربت کی چوٹی سے ایک چشمہ نکلتا ہے۔ جس کو ''چٹا کٹھا'' (سفید نالہ) کہتے ہیں۔ اس کا پانی دودھ کی طرح سفید ہے۔ اُس کے اوپر ایک جھیل ہے، جس کو 'چٹا سر' (سفید نالہ) کے ہیں۔ ہری پربت ایک جڑواں چوٹی Twin Peak ہے۔ اگر ہم اسے شونٹھر جھیل سے دیکھیں تو یہ ہمیں چاند صورت میں نظر آتی ہے۔ دائیں طرف کے پہاڑ کو گھوڑا میدان کہتے ہیں۔ اس کے روبرو ایک شیو لنگھم نظر آتا ہے۔ ان پہاڑوں، درّوں، جھیلوں، سروں چشموں اور مذہبی یادگاروں کا ذکر 'شاردا تاریخ کے آئینے میں' میں تفصیل سے آتا ہے۔ ایک بات واضح ہے کہ یہاں کی ہر یادگار اور سیاحتی مقام کا قدیم نام بدستور ہے۔ حالانکہ یہاں کی پوری تاریخ ہندو عقیدے سے جُڑی ہوئی ہے۔ اور وہی نام آج کی تاریخ میں مستعمل ہیں جو پانچ ہزار سال پہلے تھے اور جو وادیٔ کشمیر اور اُتر پردیش کے اُترا کھنڈ ریاست کے ہندو استھاپنوں کے ہیں، کچھ نام بگڑتے بگڑتے بگڑ گئے ہیں۔

ایک گاؤں جس کا نام 'ناگدر' ہے۔ یہاں ٹھنڈے پانی کا ایک چشمہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس گاؤں کا نام اسی چشمے جسے کشمیری میں 'ناگراد' کہتے ہیں، سے پڑا ہے۔ یہاں بھی چند کشمیری نژاد گھرانے تھے، جن میں سے کُنبے ہجرت کر کے مظفر آباد جا بسے ہیں۔ اسی گاؤں کے ایک نوجوان کشمیری نے کہا کہ اس چشمے سے 'تُرزِ تزیش' نکلتا ہے۔ اُس نے میرے ساتھ بات تو ٹوٹی پھوٹی کشمیری میں کی، لیکن یہ

دو الفاظ خالص کشمیری بولی کے استعمال کیے۔ اُس نے کہا کہ ہماری خواتین تیس سال پہلے تک سر پر 'کسابہ' پہنتی تھیں اور پاؤں میں پول یا کھیڑی.......عورتیں و مرد زبردست چاق و چوبند اور محنتی ہوتے تھے۔ شرافت، حسنِ اخلاق ہمدردی اور انسانی اقدار اُن کے اندر اللہ نے کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ حالانکہ یہ قدریں آج تک زندہ ہیں، لیکن وقت اور زمانے کے خاموش انقلاب کے آجانے سے اب اِن اعلیٰ اقدار کا زوال اور انحطاط شروع ہو چکا ہے۔

شاردا تاریخ کے آئینے میں

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ تاریخ کے صفحات پر 'شاردا پیٹھ' کی پھیلی ہوئی کہانی پڑھ کر اس درسگاہ کی علمی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ راز فی الوقت دنیا والوں پر منکشف نہیں ہو سکا کہ اس تہذیب کی بنیاد ڈالنے اور اس کے خدوخال بنانے اور سنوارنے میں انسانوں نے کوششیں کیں یا پھر جنّات اور مافوق الفطرت کرداروں کا ہاتھ رہا۔

اس میں شک نہیں کہ ابتداء شیومت (ہندو دھرم کی قدیم ترین میتھالوجی) سے ہوتی ہے۔ تاہم وادیٔ نیلم اور پاکستان کے زیرِ انتظام کشمیر میں جملہ حوالہ جات تواریخ قدیم و جدید تذکرہ ہا کے ساتھ شاردا پر قابلِ صد فخر و تحسین کام ہوا ہے۔ اُس کا حوالہ دینا بہت ضروری سمجھتا ہوں۔ میں یہاں چند تحقیقی کتب کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو میرے پاس اس وقت موجود ہیں۔ اور اس کتابچہ کی تیاری میں ان ہی کتب

سے استفادہ کیا ہے۔ ان میں.....

۱۔ شاردا تاریخ کے ارتقائی مراحل از خواجہ عبدالغنی۔

۲۔ تاریخ ثقافت نیلم رشید شاہ فاروقی۔

۳۔ 'شاردا' سہ ماہی مجلّہ 2009ء۔

۴۔ مطالعۂ کشمیر۔

۵۔ ناگ سے نیلم تک از سمیع اللہ عزیز منہاس۔

۶۔ آئینۂ دراوہ۔

۷۔ شاردا دیوی اے آر دانش اور رسالہ صدائے نیلم۔

'شاردا تاریخ کے ارتقائی مراحل' سے اقتباسات

۱۔ شاردا دیوی ماضی بعید میں اہلِ ہنود کے نزدیک مقدس پیشوا رہی ہے۔ اس کی جنم بھومی شاردا گاؤں ہے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ ۳۰۰۰ ہزار ق م سے لے کر ۲۵۰۰ ق م کے درمیانی عرصہ میں سراس وتی کے آرین نے شاردا دیوی کے عقیدے کو ٹھوس شکل دی ہے۔ (رتن کول)

شاردا دیوی کی مجسّم شکل

۲۔ ایک نوجوان دوشیزہ راج ہنس پر سوار اپنے چار ہاتھوں میں دُنیا کے تمام علوم کی کتابیں تھامے بغل میں شہد سے بھرا ہوا مرتبان والے سرسوتی جھیل (ناردا پہاڑی) کے اوپر تیری ہے۔ (راج ترنگنی جلد اول شلوک 29 ،ابوالفضل آئینِ اکبری)

۳۔ سری چلرا افلاسفی، جو دنیا کے تمام مادی اور روحانی وسائل کا قابلِ قبول

حل پیش کرتی ہے.... شاردا کنڈل کے اوپر متعین پتھر کی سلیب، اس فلسفے کی خالق مانی جاتی ہے Abode of goddess sharda online

۴۔ میں شاردا دیس کا باسی ہونے پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ کیونکہ میرے دیس کا ہر باسی پڑھا لکھا اور سمجھدار ہے۔ (کلہن پنڈت 1055ء)

۵۔ ہندوستان کی شمالی ریاست کشمیر کی راجدھانی سرینگر سے تین پڑاؤ کی مسافت پر بلور اور کشمیر کے پہاڑوں کے دامن میں 'شردھ' (شاردا) نامی لکڑی کا حیرت انگیز بُت ہے۔ یہ جگہ اہلِ ہنود کے لئے مقدّس ترین مانی جاتی ہے (کتاب الہند از ابوریحان البیرونی 1031ء) جس کے پاؤں چھونے سے انسان کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ پڑتا ہے۔

۶۔ شاردا تیرتھ کے اندر ایک لکڑی کا بُت ہے۔ ۱ جس کے پاؤں چھونے سے انسان کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ پڑتا ہے۔ نیز اشٹمی کی مقدّس رات کے نصف پہر کو شاردا تیرتھ کا مرکزی حصہ کسی غیبی طاقت کی مدد سے جھومتا ہے۔ (بحوالہ ابوالفضل۔ آئین اکبری)

۷۔ ''دیوی شاردا کی یاترا کے وقت انسان فوراً مدھومتی اور سرسوتی کے قریب پہنچتا ہے۔ جس کی شاعر (تعلیم یافتہ لوگ) پوجا کرتے ہیں''۔ (پنڈت کلہن راج ترنگنی حصہ اول)

۸۔ شاردا دیوی سے 'منی شنڈالیا' کو اپنے تین مقدس روپ یعنی شاردا سرسوتی اور واگ دیوی کے درشن دینے کے بعد شاردا کنڈ (چشمے) میں چھلانگ لگا دی۔ اس طرح سے وہ شاردا کے مقدّس وان (جنگل) میں داخل ہو کر امر ہو

گئی۔ (بحوالہ مقدّس نظم شاردا مہاتمایا)۔ ۱

۱ آج اس بُت کا نام ونشان بھی نظر نہیں آتا۔

۹۔ شاردا کا مندر یا زیارت آریائی فنِ تعمیر کا ایک ایسا شاہکار ہے، جس کو ہندو اور مسلمان دونوں یکساں عقیدت و احترام سے مانتے ہیں۔ مذہبی پیشواؤں اور پنڈتوں کا کہنا ہے کہ بغیر مذہب وملت جو بھی شخص شاردا کی زیارت سچے دل سے کرے گا، دلی مراد پائے گا۔ ۲

۲ A Gazetteer Of Kashmir No 430, 1867, AD

۱۰۔ تاریخی شواہد سے یہ بات ہے کہ شاردا ماضی میں علم وحکمت اور فنون لطیفہ کی مقدس دیوی کے روپ میں جانی جاتی ہے۔ اس دیوی کی جنم بھومی 'شاردا کنڈ' کے مقام پر شاردا رسم الخط میں طلباء کو دنیا کے جدید ترین علوم اور فنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ شاردا پیٹھ سے فارغ التحصیل طلباء ہندوستان بھر کی ریاستوں میں جا کر اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔ ریاست ٹیکسلا میں کالی داس اور کرناٹک میں موجودہ میسور کی ریاست میں پنڈت بلہن کا مہا پنڈت کے عہدے پر متمکن ہونا اس کی ٹھوس مثالیں ہیں۔ کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ دنیا میں تحریر میں لائی جانے والی گرائمر کی کتاب جو کہ گجرات (پاکستان) کے راجہ جیا سمہا کے حکم

سے تصنیف ہوئی ،شاردا کی علمی لائبریری سے مواد حاصل کر کے لکھی گئی تھی۔(بحوالہ ڈاکٹر خرم قادر، رتن کول) [1]

[1] Sharda an ancient place Abode of Goddess Sharda

مندرجہ بالا تاریخی شواہد کو جمع کرنے کے بعد ایک مؤرّخ کے ذہن میں شاردا کے بارے میں جو مخصوص تاثر اُبھر کر سامنے آتا ہے، اہلِ دانش کو یہ سچائی تسلیم کروانے پر مجبور کرتا ہے کہ شاردا صرف کشمیر میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان بھر میں مقدّس ترین مقام تصوّر کیا جاتا رہا ہے۔ یہ صرف ایک ہندی دیوی کی وجہ سے مشہور نہیں بلکہ یہاں سے ایک ایسی تہذیب نے جنم لیا، جس نے دنیا کی مہذّب اقوام میں اپنا منفرد اور ممتاز مقام حاصل کیا۔ سری چکر نا فلاسفی۔ پنچ استوری اور گھورت رائی جیسی رسومات شاردا مائی کو علم وحکمت وفنونِ لطیفہ کے لئے مخصوص کرتی ہیں۔ اس مختصر سی کتاب کو پڑھنے کے بعد کشمیر کا وہ بیٹا جسے شعوری یا لاشعوری طور اپنی مقدّس دھرتی ماتا کی تاریخ سے دور رکھا گیا ہے، بہت قریب آجائے گا۔ وہ اُس وقت خوشی سے جھوم اُٹھے گا، جب اسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ ایک ایسی باشعور اور سمجھدار تہذیب کا فرد ہے، جس کے پاس نیل مت پوران، وکرمانک، دیوچیرت، ہرش چیرت سری کنٹھ اور راج ترنگنی جیسی مستند تاریخی کتب موجود ہیں۔ اُس وقت اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہے گی جب وہ مغرب کے نامور مؤرّخین یعنی اول اسٹائن، میجر بیٹس، سروالٹر لارنس، ڈاکٹر کننگھم اور ڈاکٹر ایلمز جیسی شخصیات کی تحریروں سے اپنے وطن کی تاریخ کے مستند ہونے کا اعتراف پائے گا۔ اس کتاب کو پڑھ کر ایک عام قاری شاردا دیوی، شاردا مائی شاردا دیس یا شاردا منڈالا سے منسوب مذہبی اور تہذیبی ارتقاء اور اس کے مرحلہ وار ادوار سمجھ سکے گا۔

شاردا رسم الخط (لپی)

احسان الرّحمان دانش کی مختصر سی کتاب (بروشر)

سے چند اقتباسات

'قریباً ہزار سال قبل آزاد کشمیر کے موجودہ صدر مقام مظفرآباد سے شمال مشرق کی جانب 136 کلومیٹر کے فاصلے پر وادیٔ نیلم کے فلک بوس پہاڑں اور سدا بہار جنگلات کے دامن میں جھیل نما ندی کے کنارے دو جُڑواں بہنیں رہتی تھیں۔ اُن میں سے ایک کا نام مائی شاردا اور دوسری کا نام مائی ناردا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب سرس وتی و آرین شمالی درّوں سے یہاں آن وارد ہوئے۔ ان کے ہاں مندر، گرجا اور مسجد کا کوئی تصوّر نہ تھا۔ یہ لوگ سورج، چاند، ستاروں اور درختوں کے علاوہ علاوہ آگ اور بھوت پریت کی پوجا کرتے تھے۔ اور اپنے مُردوں کو گھر کے آتش دان یا چولہے کے ارد گرد دفن کرتے تھے۔ ۱

اس کے برعکس مائی شاردا اور مائی ناردا کے عقائد میں خدا کے واحد اور قادر

مطلق ہونے کا تصوّر پایا جاتا تھا اور یہ قدرتی رعنائیوں سے بھری وادی میں حقیقی عبادت میں مشغول رہتی تھیں۔ جس کے باعث کشمیری شیومت (عقیدۂ توحید) ناردا اور شاردا کے پہاڑوں سے اُبھر کر شمالی ہندوستان کے علاقوں میں پھیلا۔ ۲

اس طرح قدرتِ خداوندی نے ان دونوں جڑواں بہنوں کو اپنی عبادت گزاری کے عوض غیر مرئی قوتوں یعنی دیوؤں، جنّات اور بھوت پریت کا صاحبِ اختیار بنا دیا۔ تاریخی اندازے کے مطابق اُن کا قلعہ نما خوبصورت محل شاردپ تیرتھ یا زیارت کے عقب میں 'گھنیش گھاٹی' سے دو کلومیٹر دور تھا جو بعد ازاں زمانہ کا سفر کرتے ہوئے سری سہلا کہلایا۔ ۳

مائی ناردا نے دریائے نیلم کی شمال مغربی سمت ایک پندرہ ہزار فٹ بلند پہاڑی چوٹی پر اپنے ماتحت غیر مرئی مخلوق کی مدد سے ایک نیا محل تعمیر کروایا اور ایک خوبصورت جھیل بنائی، جو سرس وتی، واگ دیوی یا ناردو کے نام سے مشہور ہے۔ ۳

۱ راج ترنگنی (کلہن) ۲ شاردا، تاریخ کے ارتقائی مراحل (خواجہ عبد الغنی) ۳ قدیم تاریخ ہند از غلام مصطفٰے ابسمل۔

اُس ترقی یافتہ دور میں شاردا کا شہرہ ساری دنیا میں عام ہو گیا تھا۔ اور بودھ خواہ کہیں کے بھی ہوں، اسی زبان میں بات کیا کرتے تھے۔ یہ زبان موجودہ مقامی زبان پہاڑی کا علمی اور مذہبی روپ تھا۔ ماہرین کا یہ خیال یہاں بالکل سچ اور حقیقت پر مبنی نظر آتا ہے۔ کہ جب کوئی زبان علمی، ادبی اور مذہبی بن جاتی ہے، تو وہ عام لوگوں سے دور ہو جاتی ہے اور زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ شاردا کی پراکرتی زبان

پہلے سنسکرت کی اُپ بھرنش قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ اور بودھ دھرم کے پرچارک اسی زبان کو اپنا میڈیم بنائے ہوئے تھے۔ بودھ دھرم کے زوال کے بعد ہندو دھرم کے پنڈتوں اور مبلغین نے اس میں اپنی مرضی کے مطابق کئی تبدیلیاں لائیں اور بودھ دھرم کی علامتوں اور مذہبی اصطلاحوں کے بدلے ہندومت کے پرچار میں استعمال ہونے والی زبان اور اصطلاحیں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ عقیدے میں فرق آنے سے اس سے جُڑے ہوئے الفاظ بھی بدلتے گئے۔ اس عمل میں سینکڑوں سال لگ گئے۔ گریرسن کے مطابق شمال مغربی ہند میں بولی جانے والی بولیوں کا رسم الخط 'شاردا لپی' ہی تھا۔ جو صدیوں تک رائج تھا۔ معلوم دور کے ماہرینِ لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ ولیم ولسن ہنٹر کی کتاب 'A Brief History Of Indian People' میں فاضل مصنف لکھتا ہے کہ جب ہم قدیم تاریخ پر نظر دوڑاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک معزز قوم شمال مغرب کے درّوں سے گزر کر ہندوستان میں داخل ہوگئی۔ یہ لوگ اپنے آپ کو آرین یعنی مقدّس کہلاتے تھے۔ اس قوم کے نسلی ڈانڈے انڈو جرمن نسل سے جا ملتے ہیں۔ شاردا رسم الخط اپنی آریاؤں سے منسلک ہے اس لئے باقی رسم الخطوں کی طرح بائیں سے دائیں طرف لکھا جاتا ہے۔ کشمیری مؤرخ کے، اے، کلا اپنی کتاب Cultural Heritage Of Kashmir میں لکھتا ہے کہ آٹھویں صدی کے گرد و نواح میں شاردا رسم الخط شمال مغربی ہندوستان بشمول حیدر آباد دکن، بنگال اور نیپال کی جملہ آبادی کا واحد رسم الخط تھا۔ جس میں بین الاقوامی معاہدوں کی عبارت، صلح نامے، یا معاہدے اہم نوعیت کے کتبے، شاہراؤں کے نام

شہروں اور گاؤں کے سائن بورڈ کتابیں اور رسالے لکھے جاتے تھے۔ شاردا رسم الخط کا ابتدائی زمانہ 855ء سے کافی پہلے کا زمانہ تصوّر ہوتا ہے۔ اس کا سراغ ڈاکٹر حسن دانی کے دریافت کردہ کتبے سے لگایا جا سکتا ہے۔ فاضل محقق نے صوبۂ سرحد میں اٹک کے نزدیک ہند نامی گاؤں سے ایک کتبہ دریافت کیا اس پر شاردا رسم الخط میں 774ء کا سن تحریر ہے۔

شاردا رسم الخط کا وادی کے اندر مسلسل ہر دلعزیز ہونا خصوصاً، مسلمانوں کے اندر اس کا استعمال اس کے ترقی یافتہ ہونے کی علامت ہے۔ سرینگر کے ایک مسلمان بزرگ بہاؤ الدین کے مزار پر تمام کتبوں کو شاردا رسم الخط میں لکھا ہوا پایا۔ یہ مزار سرینگر میں ہے اور اس پر شاردا رسم الخط میں 1484ء لکھا ہوا ہے۔

محقق اور ماہر لسانیات Joseph Wage لکھتے ہیں، جہاں تک اس زبان کی تاریخ کا تعلق ہے، تمام جائزے اور مشاہدے یہ بتاتے ہیں کہ یہ آریائی زبان گروہ کے ذیلی دردی گروپ سے تعلق رکھتی ہے، جو دیوناگری سے کئی لحاظ سے ملتی جلتی ہے۔ یہ شاردا کی مقدس دیوی کی مناسبت سے شاردا زبان کہلاتی ہے۔ (کیونکہ شاردا یونیورسٹی کا میڈیم یہی زبان تھی)۔

شاردا جو کہ انیسویں صدی عیسوی میں اپنے آپ کو 'کاشر' زبان کہلانے لگی۔ اور شاردائی رسم الخط تبدیل کر کے فارسی (شاہ مکھی) رسم الخط اختیار کیا، کے بارے میں Sir Walter Lawrance نے 'ویلی آف کشمیر' میں صفحہ 454 سے تا صفحہ 465 میں لکھا ہے۔ ''کاشر جو کہ اہلِ کشمیر کی مادری زبان ہے، دراصل سنسکرت کی ایک ترقی یافتہ اور تبدیل شدہ شکل ہے۔ زمانۂ قدیم میں یہ لکھی جانے

والی زبان کوشاردارسم الخط میں لکھا جاتا تھا۔شاردارسم الخط دراصل دیوناگری رسم الخط کی ایک متبادل شکل ہے۔

کشمیری زبان میں کچھ ایسے الفاظ ہیں، جن کے مخرج کو فارسی زبان میں سمونا یکسر ناممکن ہے۔اس لئے فارسی (شاہ مکھی) رسم الخط میں لکھی گئی کشمیری کو صرف وہی پڑھ سکتا ہے، جوخود اس زبان کو جانتا ہو۔حقیقت یہ ہے کہ شاردارسم الخط وہ واحد طریقۂ تحریر ہے، جس کے ذریعے کشمیری زبان وادب کو اس کے اصلی متن اور تمام صوتی اُتار وچڑھاؤ کے ساتھ تحریر میں لایا جاسکتا ہے''۔

اپنی دلیل کو آگے بڑھاتے ہوئے فاضل مؤرّخ نے کشمیری کو آریائی زبانوں کی ایک شاخ ثابت کرنے کے لئے ایک سائنسی جائزہ پیش کیا ہے۔بقولِ اس کے 'شاردا' زبان جو کہ فی الوقت (1889) کی کاشر زبان کہلاتی ہے۔لسانی تجزیے سے ثابت ہوا ہے کہ اس زبان کے سو الفاظ میں سے ۲۵ سنسکرت ۴۰ فارسی ،پشتو، ہندکو اور شمالی علاقوں میں بولی جانے والی جملہ زبانیں ۱۵ پنجابی، ۱۰ اڈوگری، ۱۰ اتر کی زبان کے الفاظ پائے جاتے ہیں [1]

[1] 'شاردا تاریخ کے ارتقائی مراحل' (خواجہ عبدالغنی)

[2] J.P.Hugal

شاردا یونیورسٹی

عام تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ شاردا یونیورسٹی یا دارالعلوم شاردا دیوی کے پتھروں سے بنائے گئے مندر کے گردونواح میں کوئی جگہ تھی جس میں طلباء کو دنیاوی اور روحانی علوم کے علاوہ فائن آرٹس کی تعلیم بھی دی جاتی تھی، پروفیسر بوہلز نے لکھا ہے۔ It is due to Jana Rajas highnotion of the Scientific Greatness of the country Sharda اسی طرح گیارھویں صدی کے وسط میں ریاست میسور کے مہا پنڈت کا یہ بیان کہ شاردا ایک ایسی جگہ ہے جہاں کا ہر شہری لکھا پڑھا اور سمجھدار ہے۔ایسے بیانات جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ شاردا کی سرزمین پر کوئی نہ کوئی تعلیمی درسگاہ ضرور رہی ہے، کیونکہ زمانہ قبل از تاریخ سے ہی یہ سرزمین علم وحکمت اور فائن آرٹس کی دیوی کی سرزمین مانی جاتی ہے [2]

سرسوتی اور کشن گنگا کا مقدس سنگم، جس جگہ سرگن نالہ دریائے نیلم میں گرتا ہے ،اس جگہ کو کشمیری پنڈت سرسوتی سنگم کے نام سے پکارتے تھے اور اس جگہ غسل یا

اشنان کرنے سے اُن کے عقیدے کے مطابق اُن کے آباء واجداد کے گناہ معاف ہو جاتے تھے۔

عہد قدیم میں شاردا نالے کو مدھومتی کہا جاتا تھا۔ ہندو عقیدے کے مطابق اس ندی میں نہانے والے کے سابقہ گناہ معاف کر دئے جاتے ہیں اور روزی میں برکت ہوتی ہے۔

شاردا سے سات کلو میٹر دور جنوب کی طرف تیزیاں کے نواح میں تجوانہ کنڈ موجود ہے۔ یہاں متعدد کُنڈ اور بھی موجود ہیں۔

مؤرخین کا ایک گروہ اس خیال کا حامی رہا ہے کہ شاردا دیوی اس علم وحکمت کی ایک بین الاقوامی علامت ہے۔ اس لئے برصغیر ہندو پاک بشمول چین وجاپان میں تعلیم وتربیت کے لئے جو بھی ادارے قائم کئے جاتے تھے، انہیں شاردا پیٹھ ہی کا نام دیا جاتا تھا۔ اس طرح جیسے آجکل ہر تعلیمی ادارے کو جامعہ یا یونیورسٹی کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شاردا یونیورسٹی شاردا مندر سے تقریباً پینسٹھ میل جنوب میں وادئ کرناہ کے علاقے میں تعمیر کی گئی تھی۔

شاردا رسم الخط

شاردا رسم الخط مقدس ترین مندر یا پیٹھ شاردا سے نسبت ہونے کی وجہ سے دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ ماہرین لسانیات کے مطابق رسم الخط کو کسی بھی زبان کا گودام یا سٹور روم کہتے ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے خیال کے مطابق اگر ہم قدیم کشمیری بھاشا اُپ برہما (بھرنش) کو جانچیں تو معلوم ہوگا کہ اس نے بھی مختلف ادوار میں مختلف روپ اور تحریری نمونے بدل کر شاردا رسم الخط کی شکل اختیار کی ہے۔ تاریخ نویسی کے فن میں باقی ماندہ بدنصیبوں میں سے ایک بڑی بدقسمتی یہ بھی ہے کہ کشمیر میں رسم الخط کے بارے میں ابتدائی آریائی دور سے لے کر بدھ مت کے زوال کے دور تک کوئی مستند ریکارڈ میسر نہیں ہے۔ اس نامعلوم عرصہ کے دوران جو بعض تذکروں میں ۳۰۰۰ ق م سے لے کر ۶۰۰ تک کا عرصہ ہے، ان لوگوں نے بے شمار رسم الخط اور اندازِ تحریر ایجاد کئے، جو تاریخ نویسی کا مربوط نظام نہ ہونے کی وجہ سے دنیا سے معدوم ہو گئیں۔ اگر آج ہمیں ان پرانی تحریروں کا کوئی

نمونہ یا کتبہ ملتا ہے تو اس عبارت کو پڑھنے سے قاصر ہیں۔ ہماری بے بسی اُس وقت قابلِ دید ہوتی ہے جب ہم ٹیکسلا کے میوزیم میں ایک سفید پتھر کی سلیب پر ایک گمنام رسم الخط والی تحریر کو دیکھتے ہیں۔ پتھر کی اس سلیب پر کیا پیغام درج ہے، کوئی نہیں جانتا۔ اسی طرح وادیٔ نیلم کے ایک تاریخی مقام تہجیاں یا تیزیاں سے برآمد ہونے والے سکّوں پر موجود تحریری نقاش کو جب پاکستان کے سب سے بڑے ماہر آثارِ قدیمہ احمد حسن دانی کو دکھایا گیا تو موصوف نے جواب دیا کہ یہ سکے گوننداول سے پہلے کے بادشاہوں کے دور کے ہیں۔ ان پر جو لکھا ہے، اتنا قدیم ہے کہ جنوبی اشیاء کے تمام رسم الخط سے مختلف ہے۔ لہٰذا اُنہیں معلوم کہ اس عبارت کا کیا مفہوم ہے اور یہ کس زبان کا رسم الخط ہے۔ ۲ے

عالمی سطح کے ماہرینِ لسانیات اور برصغیر ہند و پاک کے معروف محققین کی مستند تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ شاردا رسم الخط بودھوں کی ایجاد ہے۔

۲ے

۲ے 'شاردہ تاریخ ارتقائی مراحل' خواجہ عبدالغنی۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان کی ریاست اُتر پردیش کے الہ آباد کے شہر کے قریب بھی ایک مقام ہے، جسے سنگم کہتے ہیں۔ جہاں تین دریا گنگا (ہندوؤں کا مقدس دریا) جمنا اور سرسوتی ملتے ہیں۔ الہ آباد کے سنگم میں بھی ہر سال ایک ایسا دن آتا ہے جب سارے ہندوستان سے ہندو شردھالو آ کر غوطہ زن ہوتے ہیں۔ جن

ے بقول شاستروں کے اُن کے تمام پاپ دھل جاتے ہیں۔

۲ے 'شاردا تاریخ کے ارتقائی مراحل' (خواجہ عبدالغنی)۔

شاردا رسم الخط پر مشہور محقق سٹین کے لئے زیادہ تر مواد فراہم کرنے والی شخصیت ڈاکٹر بلہر ہیں۔ ڈاکٹر موصوف شاردا زبان و ادب کے بارے میں لکھتے ہیں۔ 'شاردا' رسم الخط کے بارے میں عام رائے یہی ہے کہ قدیم رسوم الخط میں سے ایک ہے اور شاید گپت دور سے بھی قدیم ہے۔ یہ سنسکرت کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس زبان کے بارے میں جو منفرد بات نوٹ کی گئی ہے، وہ اس میں موجود ضرب الامثال، محاورے، معنوی گہرائی اور ترنم ہے۔

میجر بیٹس نے 'اے گیزیٹر آف کشمیر' کے صفحہ 4 تا95 میں شاردا رسم الخط پر بحث کی ہے۔ اس کی تمام بحث کا خلاصہ یہی ہے کہ یہ زبان اور اس کا رسم الخط اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ شاردا بھاشا آریائی زبانوں کے کسی گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اپنی دلیل میں فاضل نے بھی سر لارنس کی طرح کا ایک مقالہ پیش کیا ہے۔ فاضل مصنف نے ڈاکٹر المز لی کا ایک حوالہ نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ ڈاکٹر المز لی نے یہ واقعہ ڈاکٹر لیٹنر کی کتاب سے نقل کیا ہے۔ واقعہ اس طرح ہے۔

''دو ہزار سال پہلے کی بات ہے کہ ریاست یاجیاں میں ایک نیک شہزادہ رہتا تھا۔ اُس کا بڑا بھائی اس ریاست کا بادشاہ تھا۔ اس کی بھاوج ایک بدکردار عورت تھی۔ شہزادے کا نام بکرماجیت تھا۔ یہ بدکردار عورت بکرماجیت کے ساتھ ہم بستری کرنا چاہتی تھی۔ جب کہ بکرماجیت نے ثابت قدمی سے اس عورت کی

خواہش کو ٹھکرا دیا۔ عورت انتقامی کارروائی پر اُتر آئی اور بکر ماجیت کے خلاف ایک جھوٹی کہانی گھڑ لی۔ اس طرح اس بدکردار عورت نے ایک نیک شہزادے کو جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ جلاوطن شہزادہ گھومتا ہوا کشمیر پہنچا۔ بکر ماجیت کے ساتھیوں میں ایک کا نام شاردا نندن تھا۔ لکھنا پڑھنا جانتا تھا۔ اُس نے کشمیر میں لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا۔ پس اس شخص کے نام کی مناسبت سے شاردا رسم الخط وجود میں آ گیا۔'
۱ ۲

اس حکایت کو اگر راج ترنگنی کے مستند حوالوں سے جوڑ کر دیکھا جائے تو وہاں کلہن یا اُجیان کے راجہ بکر ماجیت کا ذکر ماتر گپت کے حوالے سے کرتا ہے۔ اسی گپت کے نیک کاموں اور تذکروں سے کشمیر کی تواریخ بھری پڑی ہے۔ روپ کرشن بھٹ ایک اور دانش اور محقق اپنی کتاب Descriptive Study Of Kashmiri Language میں شاردا رسم الخط کے بارے میں لکھتا ہے کہ شاردا دراصل قدیم برہمی رسم الخط کی ترقی یافتہ شکل ہے، چونکہ کشمیری آباد کے عقیدے کے مطابق شاردا ہی وہ واحد دیوی ہے، جس کے ہاتھوں میں دنیا کے تمام علوم اور زبانوں کی طنابیں ہیں۔۳

قدیم ادب نیل مت پوران اور تواریخ راج ترنگنی کے علاوہ تمام کتب جن کا حوالہ بعد کے تذکرہ نگاروں نے دیا ہے۔ اس کے علاوہ راج ناتھ کاستی کی لکھی ہوئی کتابیں 'مہاینی' اور 'پرکاش' اور النکار سرو اسوا شاردا رسم الخط میں لکھی گئی ہیں۔

جہاں تک جدید دور میں شاردا زبان میں شاعری کا تعلق ہے، ہم چودھویں صدی عیسوی کی مشہور کشمیر صوفی شاعرہ لل ایشوری یا لل عارفہ (لل دید) کے کلام کو

قدیم شاردا اور جدید فارسی کے درمیان ایک پُل مانتے ہیں۔ اس عظیم شاعرہ کے علاوہ اس دور میں کی بڑھانی 1475ء وِلھا بھا دیو کی پدیاوالی 1550ء اور شیو پد ہا کی وجہانا بہائر و قابل ذکر ہیں۔

شاردا رسم الخط میں نثر میں کئی تاریخی کتب کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ ان میں بڈشاہ کے زمانے کی 'جون راج ترنگنی'، محمد شاہ کے زمانے میں ایک پڑھے لکھے شخص رسول کنٹھ نے کئی کتابیں شاردا زبان میں لکھیں۔ اکبر کے عہد میں پراجیا بھٹ نے بھی شاردا رسم الخط کو اپنایا۔ اسی زمانے میں حبہ خاتون (زون) کی شاعری کا چرچا عام ہوا۔ زون کا کلام خطِ نسخ اور خطِ کوفی میں لکھا گیا ہے۔ شاردا رسم الخط میں لکھی گئی کچھ کتابوں اور قلمی نسخوں کا صرف ذکر ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کچھ نسخے لندن اور دہلی کے عجائب خانوں میں موجود ہیں۔ بھاوانی داس کرچو نے شاردا زبان میں ایک مکمل تاریخ لکھی ہے۔۴

۱ ۲ ۳ شاردہ تاریخ کے ارتقائی مراحل (مصنف خواجہ عبدا لغنی) ۴ خواجہ عبدالغنی

وادیٔ نیلم کا وہ حصہ جو شاردا سے ملحق ہے سو فیصدی ہندو عقیدے کے زیر اثر رہا ہے۔ جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ یہاں پر ندی نالے، چشمے، جھیل، پہاڑی اور بستی کا نام غیر مسلم عقیدے سے جُڑے ہونے کا ثبوت ہے۔ بجائے خود شاردا/ ناردا سرسوتی، مدھومتی، کرشنا گھاٹی، شنکر، گنڈِ امنی شنڈالیہ، ستاپا، اسٹوپا

(بودھ اصطلاح) سائی مالا، شارداون، سرگن نالہ سری سہلا قلعہ، گھنیش غار وغیرہ۔

'شاردا' قلعے کی ہمسائیگی میں حضرت جمال الدینؒ کا مزار ہے جو 1430ء میں حضرت شاہ ہمدانؒ کے ہمراہ کے ساتھ واردِ کشمیر ہوئے ہیں۔ حضرت جمال الدینؒ کشمیر کے ایک بزرگ حضرت بابا عبداللہ گزریالیؒ کے ہمراہ وادیٔ کشن گنگا تشریف لائے تھے اور یہیں قیام فرما کر انتقال فرمایا تو مقامی لوگوں نے جو مسلمان بن گئے تھے، اِنہیں شاردا یونیورسٹی کے قریب دفن کر دیا۔ یہ مقام آج مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔ اُن کی قبر کے سرہانے لگائے گئے برگد کے اکلوتے درخت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ درخت ازبکستان سے لایا گیا ہے اور مزار پر لگایا گیا ہے۔ اس قسم کا درخت اس پوری وادی میں کہیں اور نہیں ملتا۔ یہ معلومات جناب احسان الرحمان دانشؔ کی 36 صفحات کی کتاب 'شاردا دیوی' سے حاصل ہوئی ہے۔ شاردا دیوی کے حوالے سے جو کتابیں اور مقالے پاکستان یا پاکستان کے زیرِ انتظام کشمیر میں لکھی گئی ہیں، ان سے اس تاریخی مقام میں لوگوں کی دلچسپی کا پتہ چلتا ہے، جو علاقے کے عوام کی تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی تاریخ کی شناخت کے تئیں دل چسپی کا مظہر ہے۔ ان کتابوں میں ان مذہبی اور تاریخی مقامات کی تصویریں موجود ہیں۔ شیو، پاروتی، گھنیش دیوتا اور کرشن کی رنگین جاذب نظر تصویریں بھی شائع کی گئی ہے۔ پاکستان کے مختلف علاقوں سے آنے والے ملکی اور غیر ملکی علاقے کی تہذیب وتمدن زمانۂ قدیم کی تاریخی نشانیوں میں بے حد دل چسپی رکھتے ہیں۔ مجھے وہاں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبۂ تاریخ کے تین طلباء ملے جو لاہور سے دو موٹر سائیکلوں پر شاردا اور نیلم کا مشاہدہ کرنے آئے تھے۔ ایک ریسرچ سکالر کافرستان کا

تھا، جو دردی بولی پر ریسرچ کر رہا تھا۔ اُس نے کہا کہ نیلم ویلی میں ایک گاؤں میں 'خددار' (دردی) بولی بولنے والے چند کنبے آباد ہیں (جن کا ذکر میں نے اسی مقالے میں کیا ہے)۔

شاردا رسم الخط

بودھ عالموں کی تحقیقاتی ضرورت نے جس شاردا رسم الخط کو جنم دیا تو اس میں آسان پہاڑی زبان میں نئی لپی اختیار کر کے بہت سی مذہبی کتابیں تصنیف کی جانے لگیں۔ شاردا رسم الخط کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سنسکرت لپی سے مختلف بھی ہے اور آسان بھی۔ اس نئی لپی میں جو زبان لکھی جانے لگی، اس کو عوامی زبان میں پراکرت اور سنسکرت جیسی وقت کی ادبی زبان میں سے بھی کچھ عام فہم الفاظ کے علاوہ پیر پنجال اور خطہ کوہ ہمالیہ کے دام میں بولی جانے والی مختلف مقامی ''بولیوں'' سے بے شمار الفاظ بھی چن کر شامل کئے گئے تھے۔ پس اس طرح مقامی بولیون اور وقت کی ادبی زباونوں کے میل جول سے جو نئی آسان تر اور سلیس زبان تیار ہوئی اس کو بدھ بھکشوؤں نے اپنے مذہب کو پھیلانے کے لئے اپنا لیا۔ اس زبان کی وساطت سے ہزارہ، کشمیر، ہماچل، کمہاؤں کے پہاڑوں سے نیپال تک پہاڑی علاقوں میں بدھ مت کے عالم گاؤں گاؤں پھر کر پرچار کرنے لگے۔ نیز اس کا شاردا رسم الخط بھی بڑا سہل تھا۔ اس ئے کوپ ہمالیہ کو پورے پہاڑی خطے کے لوگوں نے بدھ مت کے ساتھ لپی والی اس زبان کو اپنا لیا۔ اس طرد یکھتے ہی دیکھتے یہ زبان کشمیر سے لے کر نیپال تک تمام پہاڑی خطے میں پھیل گئی۔ اور پہاڑوں میں

رہنے والے لوگوں کی مشترک زبان بن گئی۔ کشمیر آس پاس پہاڑوں میں بدھ مت کے عروج کا زمانہ شادرا رسم الخط والی اس پہاڑی زبان کے عروج کا زمانہ مانا جاتا ہے۔

فوٹو A

مختلف ادوار میں پہاڑی زبان کے رسم اخط

SCRIPTS OF NORTHERN INDIA

انقلابات

پھر "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں" کے مصداق ایسا ہوا کہ برصغیر ہند میں چلنے والی ہواؤں کے رُخ بدل گئے۔ گو کہ بدھ مت جو کشمیر کے راستے ہندوستان سے نکل کر مشرق میں تبت اور چین تک پھیلا اور شمال مغرب میں گلگت سیکیانگ تک اور افغانستان میں بلخ، بخارا تک پھیل گیا تھا۔ مگر خود ہندوستان میں زوال پذیر ہونا شروع ہو گیا۔ زمانہ ایک بار پھر ایک مذہبی انقلاب سے دوچار ہوا۔ جب کمار بھٹ شنکر آچاریہ جنوبی ہند سے ویدک دھرم کا جھنڈا لے کر اٹھے اور انہوں نے بدھ مت اور بدھوں کی تہذیب کو پورے ہندوستان سے نیست و نابود کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ نویں صدی عیسوی میں یہ ہندو عالم میدان میں نکل آئے اور انہوں نے ہندو دھرم کو پھر سے بحال کرنے میں ملک کے طول و عرض میں دورے کیے۔ ادھر بدھ عالم جو اس زمانہ میں درباری سرپرستی کے عادی ہو چکے تھے۔ تن آسان، کھوکھلے زاہد اور مردہ دل بن گئے تھے۔ یہ کھوکھلے زاہد مذہبی بحث مباحثوں میں شانکر آچاریہ اور ان کے دوسرے ہندو عالم شاگردوں سے شکست پر شکست کھاتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے ملک سے بدھ مت کے خیمے اکھڑ گئے۔ بدھ مت ہندوستان کے مرکزی مقامات میں ایسا زوال پذیر ہوا کہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکا۔ بدھوں کے اس زوال کا اثر پہاڑی خطہ پر بھی لازماً پڑا۔ یہاں بھی بدھ مت ختم ہو گیا۔ اور اس کی جگہ ہندو دھرم نے لے لی۔

شاردا کے تنزل کا دور

ہندومت کا بول بالا ہوجانے کے ساتھ ہی پھر سے ٹھیٹھ سنسکرت زبان کا عروج ہوا اور شاردا رسم الخط میں لکھی جانے والی پہاڑی زبان جوکہ بدھ مت کو پھیلانے کے لئے رائج کی گئی تھی، دھیرے دھیرے شہروں سے ختم ہوکر اپنا دامن سمیٹے ہوئے پہاڑوں کے اندرونی خطوں اور درّوں میں پناہ گزیں ہوگئی۔ اس انقلاب کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑی زبان میں تحریر وتصنیف اور درس وتدریس کا سلسلہ پھر بند ہگیا اور واپس آئے ہوئے مذہب اور اس مذہب کے طرف دار راہبوں کی طرف سے اس زبان پر عنایت کے بجائے عتاب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک طرف اس عوامی زبان کی ترقی رک گئی تو دوسری طرف انتہا پسند بودھوں اور پجاریوں نے اس زبان میں تصنیف شدہ تمام ادبی اور مذہبی علم کے خزانے بھی پھونک دئے۔ اس طرح بدھ مذہب کے خاتمے کے ساتھ زبان کا ادبی سرمایہ بھی لٹ گیا اور اس زبان کو بولنے والے اور لوگ شہروں اور نزدیکی گاؤں سے نکل کر ان پہاڑوں ہ میں آباد ہوگئے۔ جہاں یہ زبان قدرے محفوظ تھی۔ جب سنسکرت راج دربار کی زبان دھرم کی مذہبی کتابوں کی زبان بن کر پھر اُبھر آئی۔ تو شہروں اور بڑے بڑے گاؤں میں پڑھے لکھے لوگ سنسکرت کو اختیار کرنے لگے۔ مگر جس طرح پورے ہندوستان کے دیہات میں لوگ اپنی اپنی پراکرت بولتے رہے اسی طرح پہاڑوں میں بسنے والے لوگ بھی اس کے اثر سے کسی حد تک بچے رہے اور اپنی ہی قدیمی زبان اختیار کر رکھی تھی۔

'شاردا تاریخ کے اوراق پر'

گیزیٹر آف کشمیر صفحہ 338 پر Carles Ellison Bates مصنف نے 'شاردا' کو 'شیرڈی' 'Sherdi' لکھا ہے۔ اسے کسی یونیورسٹی یا دارالعلوم سے منسوب نہیں کیا ہے۔ بلکہ لکھا ہے کہ اس مقام پر ایک ہندو مندر ہے، جو بڑے بڑے پتھروں کو ۴×۵ فٹ تراش خراش کر کے ۳۰ فٹ اونچی دیواریں بنائی گئی ہیں۔ اور اس مندر کے مرکز میں پتھروں کے ایک تخت پر ایک شیولنگ رکھا گیا ہے۔ جس کسی نے بھی یہ مندر تعمیر کیا ہے اُس نے اس کے اوپر کوئی چھت نہیں بنائی ہے، لیکن ضلعدار کرنل گنڈو وزیر وزارت مظفرآباد نے اس کے اوپر لکڑی کی چھت بنائی تھی۔ لیکن راجہ منصور خان والیٔ کرناہ نے اس عمارت کو آگ لگا دی اور توڑ پھوڑ کی۔ راجہ منصور خان کو کسی پیر نے کہا تھا کہ شاردا مندر کی عمارت میں خزانہ ہے۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ راجہ کو خزانہ ملا یا نہیں۔ بیٹس کے مطابق قلعے کے بائیں طرف گزرنے والی ندی مدھومتی جو مندر سے بمشکل ۲۰ گز جنوب کی طرف بہتی ہے نے اس قلعے کی جنوب کی طرف والی دیوار کو کچھ نقصان پہنچایا تھا۔ لیکن ضلعدار کرنل گنڈو نے اس کی مرمت بھی کروادی۔ مندر کے تین اطراف میں مقامی زمینداروں کے

کھیت ہیں، جن میں مکانوں کے علاوہ اور فصلیں بھی ہیں۔ جنوب مغرب کی طرف دریائے نیلم اور مدھومتی نالہ کے درمیان ایک چھوٹا سا بازار اور ایک جامع مسجد بھی ہے۔ بیٹس نے شاردا کی جگہ شیرڈی کیوں لکھا۔ اگر اس کی گہرائی میں جھانکیں تو ہو سکتا ہے کہ اُس نے کسی یاتری سے اس مقام کے بارے میں معلومات حاصل کی ہوں۔ کیونکہ اُس زمانے میں جب بیٹس وہاں گیا ہوگا، اُس سارے علاقے میں اسلام پھیل چکا تھا۔ خواندگی کی شرح ۲/۳ فی صد رہی ہوگی۔ شاردا سے مظفرآباد ،گلگت سے سرینگر پڑھائی کے لئے جانا معمولی کام نہ تھا۔ تین سو سے پانچ سو میل تک سکول جانا کارے دارد والا معاملہ تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ انگریزی نہ سمجھ سکے ہوں اور کسی پڑھے لکھے تیرتھ یاتری نے اُسے شیریڈی کہہ دیا ہو۔ کیونکہ شیریڈی نام کا ایک مشہور قصبہ کرناٹک میں بھی ہے، جہاں ایک سائیں بابا رہتا ہے۔ کرناٹک والا تیرتھ شیریڈی بھی آج تک ہندو دھرم کے لئے ایک مقدس مقام ہے، جہاں روزانہ ملک کے کونے کونے سے ہندو شردھالو سائیں بابا سے ملنے اور اس کا آشرواد لینے جاتے ہیں۔

شاردا رسم الخط کو ماہرینِ لسانیات نے ٹاکری اور لنڈا رسم الخط بھی لکھا ہے۔ جو صرف دو سو سال پہلے تک کشمیری اور پہاڑی (ہندکو، پوٹھوہاری) زبانوں کا رسم الخط بھی رہ چکا ہے۔ آج کل جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی کے شعبۂ لسانیات میں شاردا رسم الخط پر تحقیقی کام جاری ہے۔ شاردا لپی دیوناگری رسم الخط سے ملتی جلتی ہے۔ اور آج کل یہ کسی زبان کا رسم الخط نہیں۔ ایک بات ماننے کے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ بیٹس نے بھی شاردا کو بے حد اہم مقام کا درجہ دیا ہے۔ اُترا کھنڈ ریاست میں اُتر

کاشی، نندہ دیوی، گنگوتری اور کیلاش مانسرور کے علاوہ نندی سر، امرناتھ، (شیو لنگم) بھدرواہ کیلاش ویشنو دیوی اور دوسرے مشہور تیرتھ استھان صرف ہندوؤں کے لئے اہمیت کے حامل ہیں لیکن شاردا پیٹھ بدھ دھرم کے ماننے والوں کے لئے بھی برابر مقدس ہے۔ شاردا اس وقت پاکستان کے زیرِ انتظام کشمیر میں پڑتا ہے۔ صد فیصد مسلمان رہتے ہیں۔ اس کے باوجود مقامی لوگوں اور حکومت نے شاردا کے تاریخی مندر کے باقیات کی دیکھ ریکھ اور تحفظ کا معقول انتظام کر رکھا ہے۔

مائی شاردا

مائی شاردا کی مجسم شکل

ہندوؤں نے شاردا کی جو مجسم شکل تخلیق کی ہے، اُس کے مطابق یہ ایک دوشیزہ کی شکل میں ہے، جو راج ہنس نامی پرندے پر سوار ہے۔ اس کے سر پر سونے کا ایک چمکدار تاج اور گلے میں موتیوں کی مالا ہے۔ جب کہ مجسمے میں اس کے چار ہاتھ بھی بنائے گئے ہیں۔ ایک ہاتھ میں کتاب، ایک ہاتھ میں تسبیح، ایک میں موسیقی کا آلہ اور ایک میں شہد کا مرتبان ہے۔ کتاب سے مراد علم وحکمت، آلۂ موسیقی سے مراد تمدن یا فنونِ لطیفہ، تسبیح سے مراد دنیا کے علاوہ مذہبی عقاید اور شہد سے مراد زندگی کی مٹھاس۔ ۱

منی شنڈ الیہ اور شاردا دیوی کا درشن

شاردا دیوی کے دیدار اور درشن کے لئے ہندو سادھو سخت نفس کشی عبادت و ریاضت کرتے ہیں۔ ان کے بقول ایک سادھو نے جب سخت ریاضت کی تو اس کی شاردا کو ناردا جھیل میں تیرتے ہوئے دیکھا۔ اس درشن کا فائدہ سائی مالا کے جنگلات میں آنے کی دعوت دی۔ جب وہ گھوش نامی جنگل میں پہنچا تو اُسے شاردا مائی کا درشن ہوا۔ ۲

کشن گھاٹی

شاردا سے تقریباً دس کلومیٹر جنوب مشرق میں واقع گاؤں جسے عہدِ قدیم میں تِلگرام جبکہ عصرِ حاضر میں گھنیش گھاٹی یا کشن گھاٹی کہتے ہیں۔ 1144ء میں سردیوں کے یخ بستہ موسم میں شہزادہ بھوج نے ایک مقامی ڈامر سردار کی مدد سے دریائے کشن گنگا کے کنارے اسی پہاڑی سے ایک رسے کے ذریعے دو دفعہ لٹکنے کی کوشش کی۔ یہاں پتھروں کو تراش کر دو مورتیاں پہاڑ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ایک گھنیش جو شیوا اور پاروتی کی مشترکہ اولاد ہے۔ ۳

۱ بحوالہ شاردا دیوی، اے، آر، دانش۔
۲ شاردا تاریخ کے ارتقائی مراحل از خواجہ عبدالغنی
۳ شاردا تاریخ کے ارتقائی مراحل
۴ خواجہ عبدالغنی

شاردا پیٹھ

وجودِ عالم اورظہورِ آدمؑ سے لے کرتا ایں دم ہر ذی روح.... اس عظیم، وسیع و عریض زمین پر نہ صرف حرکت میں ہی ہے بلکہ اتفاقاً یا قصداً ایسے معرکے بھی سر کئے ہیں، جن کے بارے میں پڑھ کر یا سن کر رونگٹھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس حقیقت کہ ایمان لانے کے سوا کوئی چارہ نہیں آتا کہ خالقِ کائنات کے بعد اگر کوئی قوت اس جہاں میں ہے تو وہ صرف انسان ہے۔ انسان چاہے تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔ آج ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ معلوم دور خصوصاً زمانۂ حال میں انسانی ذہن نے ایسی ایسی ایجادات اور کارنامے انجام دیئے ہیں جن کا مشاہدہ اور مطالعہ کر کے ہم اپنے خالق اور مالک پر ایمان کو اور بھی مستحکم اور مضبوط بنانے کی سعادت حاصل کر سکتے ہیں۔

جسمانی طور پر یہی انسان جو آج ذہنی دنیا میں حیرت انگیز اور متحیر کرنے والے کارناموں کو سرانجام دے رہا ہے۔ سینکڑوں سال پہلے ایک دیو مالائی کردار کا مالک لگتا تھا۔ جنات، دیوؤں، پریوں اور بھوت پریت کے قصے کہانیاں جو ہم

اپنے بزرگوں سے محفلوں میں ان کی زبانی سنتے آئے ہیں یا کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں...... دراصل انہی انسانوں کے ناقابل یقین کارناموں پر محیط ہے۔ یہ انسان کوئی اور نہیں ہمارے اسلاف تھے۔ انہی بزرگوں نے اپنی آسیبی طاقت سے ایسی ایسی مہمات سر کی ہیں۔ ایسے ایسے قلعے تسخیر کئے ہیں...... جو زمانہ حال کے انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ الگ بات ہے اسی انسان نے اپنی خداداد ذہنی صلاحیتوں کا استعمال کر کے پورے عالم کو ایک Gobal Vilage میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے اور زندگی کے کٹھن سفر کو آسان اور محدود و مختصر بنا کر رکھ دیا ہے۔

کہتے ہیں کہ ”انسان“ کا سفر مہد سے شروع ہوتا ہے اور لحد تک جاری رہتا ہے۔ نو مہینے بطنِ مادر میں پرورش کے دوران بھی وہ ایک ان دیکھے، اور ان جانے سفر پر گامزن رہتا ہے اور لحد کی گود تک جا کر اختتام پذیر ہوتا ہے...... کسی کا یہ سفر سالہا سال تک جاری رہتا ہے..... کسی کا سفر محض چند سکینڈوں، منٹوں، گھنٹوں، دنوں، مہینوں یا سالوں تک محدود رہتا ہے۔ یہ سب اس خالق کی رضا پر منحصر رہتا ہے، جس نے مخلوق کی زندگی کو Time & Place Factor ظرف زمان اور ظرف مکان کے ماتحت بنا کر چھوڑ دیا ہے۔

حرکت سفر کی بنیاد یا پھر ابتدا ہوتی ہے۔ جس شئے میں زندگی ہوتی ہے وہی متحرک ہوتی ہے۔ اس لئے حرکت زندگی کی شرط ہے۔[1]

حضرت آدم کی داستان حیات میں شجرِ ممنوع کو چکھنے کا واقعہ بظاہر احکام زبانی کی خلاف ورزی اور آدم کی اولین بغاوت سے عبارت ہے۔ تاہم اس کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس گناہ کی پاداش میں آدم کو جنت سے نکل کر کرۂ ارضی کی طرف

مائل ہونا پڑا۔ چنانچہ آدم کا پہلا سفر ارتقائے نسل کی طرف پہلا قدم تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک ابنِ آدم کے پاؤں سے چکر نکل نہیں سکا۔ یہ چکر نکل بھی نہ سکے گا۔

۱ انور سدید

زندگی تو کیا زندگی کے بعد بھی چلے گا۔ یہ اسی وقت دم لے گا جن آدمی جنت یا جہنم میں پہنچ جائے گا۔ آدم کا جنت سے سفر ایک لاشعوری حرکت تھی..... کیونکہ وہ آدمی کا پہلا سفر تھا۔

انکشاف ذات اور حقیقت کُبریٰ کو پانے کا ایک ایسا بھی بے بدل سفر ہوا ہے جو قیامت تک اندھیروں میں آنکھوں کو چُندیا دینے والے نور کی لکیر کھینچتا اور ہدایت کا راستہ روشن کرتا رہے گا۔ یہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم (سفر) اسریٰ اور معراج شریف تھا۔

وجودِ عالم سے ہی سفر کئی طرح کے رہے ہیں۔ برّی، بحری اور فضائی۔ ابتداء میں سفر صرف زمین تک ہی محدود تھے...... ایک چیونٹی ہو یا چھوٹا کیڑا.... یا جتنے بھی حشرات الارض (زمین کے اوپر یا نیچے)، مسافر یا سفیر ہیں۔ ہاتھی، شیر، تتلی، پروانے سے لے کر عقاب تک جس کی اڑان سب سے بلند اور آخری آسمان تک ہوتی ہے۔ غرض ہر مخلوق خداوندی ''مسافر'' ہے اور زندگی میں ایک یا کئی مرتبہ سفر کا مرتکب ہونا پڑتا ہے۔ ۱

۲ آدمی مسافر ہے آتا ہے جاتا ہے۔ آتے جاتے رستے میں یادیں چھوڑ جاتا ہے۔

۳ مسافر ہوں یاروں نہ گھر نہ ٹھکانہ..... مجھے چلتے جانا۔

۴ زندگی اک سفر ہے سہانا..... یہاں کل کیا ہو؟ کس نے جانا۔

۵ زندگی کا سفر ہے یہ کیسا سفر، کوئی سمجھا نہیں کوئی جانا نہیں۔

سفر میں مسافر یا سیاح کے پاؤں سب سے زیادہ اہم ضروری اور کارآمد ہوتے ہیں۔ Clutches اور لاٹھیوں کے سہارے بھی سفر کئے جاتے ہیں۔ پہیئے کی ایجاد سے سب سے پہلے زندگی کے انسانی تصور میں اچانک تبدیلی آ گئی۔ جس طرح چلنا پھرنا دوڑنا روزمرہ کا معمول ہے اسی طرح سفر بھی زندگی کا معمول ہے۔ زندگی چونکہ خود ایک مسلسل حرکت ہے۔ اسی لئے سفر بھی اسی کا استعارہ ہے۔

انسان چونکہ فطرتاً تنوع پسند واقع ہوا ہے.... وہ مستقل ایک ہی مقام پر رہتے رہتے اکتاہٹ اور بے چینی محسوس کرنے لگتا ہے۔ یکسانیت سے گریز اس فطرت اُسے نقل مکانی پر اکساتی ہے اور مسافت طے کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ یہی آمادگی سفر کا نقطۂ آغاز ہے اور مسافت طے کرنے کے اس عمل کو سفر کہتے ہیں۔ مسافر یا سیاح جب سفر شروع کرتا ہے تو اس کا اس عمل کے پیچھے کئی نہ کوئی ارادہ ہوتا ہے... وہ کس نیت سے سفر شروع کرتا ہے یہ ایک اہم بات ہے اس کا کیا مشن (Mission) ہوتا ہے اور وہ کیوں اپنے آپ کو تکلیف اور خطرات میں ڈال کر سفر کرتا ہے۔ اصل میں اسی عنصر کی اہمیت ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ مہم جوئی کا شوقین

ہوتا ہے یا پھر اس کا مشن ''دریافت'' ہوتا ہے۔ یا کمائی یا جیت حاصل کرنا۔ فطرت پسندی اور فطرت کو سمجھنے۔ تحقیق فطرت۔ مذہبی (عقیدے) مشن۔ تجارت۔ دولت اکٹھا کرنا۔ تصرف اور راج۔

سفر کو اپنے مقاصد محرکات کے اعتبار سے کئے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً مذہبی سفر۔ تعلیمی یا علمی سفر۔ ادبی سفر۔ کاروباری یا تجارتی سفر۔ سیاسی سفر۔ شاہی سفر۔ جنگ سفر۔ مہماتی سفر۔ سفرِ ہجرت اور تفریحی سفر۔ ۶

۱۔ انور سدید

۲۔ بالی وُڈ فلم کا گیت

۳۔ بالی وُڈ فلم کا گیت

۴۔ بالی وُڈ فلم کا گیت

۵۔ بالی وُڈ فلم کا گیت

۶۔ انور سدید

ابو ریحان البیرونی نے محمود غزنوی کے عہد (۹۹۸ء سے ۱۰۳۰ء) میں ہندوستان کا سفر کیا اور ایک گراں قدر تصنیف ''سفر الہند'' جو ایک سفر نامہ بھی ہے اور ایک تحقیقی کام بھی۔ اپنے سفر کی یادگار کے طور پر مرتب کیا۔

البیرونی ایک فطری سیاح اور حصولِ علم کا شیدائی تھا۔ ہندوستان میں اس کی آمد کا مقصد بھی ہندوستانی علوم تک رسائی حاصل کرنا تھا۔ میری یہ سطور

بھی ایک سفر نامے کا ابتدائیہ ہے۔ یہ سفر نامہ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کا ہے اور اس سفر میں پاؤں کا استعمال بہت کم ہوا ہے۔ ۹۹ فیصد پہئے کی مدد سے ہوا۔ یہ سفر میں نے 'شاردا پیٹھ' پر تحقیق کی نیت سے کیا۔ آگے چل کر اس تاریخی مقام سے جڑے ہوئے حقائق کھلیں گے۔ میری مادری زبان پہاڑی ہے (جسے ہندکو اور پوٹھواری) بھی کہتے ہیں۔ چونکہ پہاڑی زبان کا ابتدائی رسم الخط 'شاردا' لپی یا ٹاکری رہا ہے۔ اس لئے میں نے اس موضوع پر چند کتابیں اور تحقیقی مقالے پہاڑی اور اردو میں لکھے اور شائع ہوئے۔ لیکن اکثر مواد جو اس موضوع سے جڑا تھا حاصل نہ ہوسکا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ 'شاردا' پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جو کچھ بھی لکھا گیا یہ حقیقی کنٹرول لائن کے اُس پار پاکستان کے زیر انتظام کے مظفر آباد اور شاردا اور اٹھمقام میں لکھا گیا۔ آزاد کشمیر مظفر آباد کے مجلّہ میں بھی کچھ تحقیقی مقالات شائع ہوئے۔

خواجہ عبدالغنی (وادئ نیلم)　　پروفیسر مشتاق احمد پرسچہ / رشید فاروقی

مظفر آباد اور اس موضوع پر لکھی گئی کتابیں نظر سے گزریں تو خاکسار کو بھی اس موضوع پر لکھنے کا شوق اجاگر ہوا۔ چنانچہ میں نے دو مرتبہ 'شاردا' کے سفر کئے۔ پہلا سفر ادھورا رہا اور مجھے شاردا سے پہلے ہی لوٹ آنا پڑا۔ دوسرا سفر الحمدللہ کامیاب رہا اور میں اُس منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ جس کا ارادہ میں نے گھر سے ہی بنا لیا تھا۔

اس ابتدائیہ میں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان چند کتابوں کا ذکر کروں جن میں وادیٔ کشمیر کو باقی دنیا سے رابطہ پیدا کرنے والے کچھ راستوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مجھے ان سب راستوں پر پیدل اور بذریعہ زمینی ٹرانسپورٹ سفر کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ضمنی طور پر میں اپنے چند اور اسفار کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو میں نے اپنی زندگی کے 60 سالوں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر کر ڈالے۔ ان میں میرا پہلا غیر ریاستی سفر لکھنؤ، آگرہ، دہلی اور پٹھانکوٹ کا تھا۔ یہ سفر گھر سے جہلم ویلی روڈ اور بانہال کارٹ روڈ پر ہوا اور مدت سفر 12 دن تھا۔ اس سفر کا سارا خرچہ محکمۂ تعلیم نے برداشت کیا اور اس میں میرے علاوہ بارہ اساتذہ کرام اور ٹرینیز تھے۔ میرا دوسرا سفر جو پہلا غیر ملکی سفر بھی تھا روس کی ریاست اُزبکستان کا تھا۔ ازبکستان کی راجدھانی تاشقند میں میرا قیام 42 دن رہا۔ یہ مشن خالصتاً علمی تھا اور اس اس کا بندوبست سید سجاد ظہیر (عرف بنے بھائی) نے کیا تھا۔ اس وقت 1972ء میں، میں سرینگر سے نکلنے والے ایک اردو روزنامے ''چنار'' کی مجلس ادارت میں تھا۔ لیکن عملاً سارا کام مجھے ہی کرنا پڑ رہا تھا۔ 1971ء قیامِ بنگلہ دیش اور بھارت پاک جنگ کے بعد یہ میرا پہلا غیر ملکی سفر تھا۔ اس سفر کے تعلق سے میں نے ایک سفرنامہ ''کوہِ قاف میں چالیس دن'' لکھا تھا جو ہفت روزہ 'حیات' دہلی کے علاوہ روزنامہ پولیٹکل ٹائمز سرینگر میں شائع ہوا تھا۔

میرے دوسرے اسفار پاکستان 28 مرتبہ، سعودی عرب (سفرِ حرمین) 2 مرتبہ، استنبول (ترکی) ایک مرتبہ، تھائی لینڈ (بینکاک) 2 مرتبہ، اپنے ملک کی لگ بھگ 80 فیصد ریاستوں اور تاریخی مقامات کے اسفار بھی شامل ہیں۔

سب سفرنامے چھپ چکے ہیں۔ اپنی ریاست کی عموماً اور وادیٔ کشمیر کی تاریخ خصوصاً دلچسپی ہونے کے سبب مجھے کشمیر پر لکھی گئی تقریباً ساری دستیاب تواریخ کا مطالعہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی اور مجھے معلوم ہوا کہ کشمیر صدیوں سے سیاحوں اور سفرا، بادشاہوں، نیک اور لُٹیرے ظالم حکمرانوں (حملہ آوروں)، مذہبی عالموں، فلسفیوں، صوفیائے کرام و اولیائے عظام کے علاوہ مہم بازوں کی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ ابوالفضل کے مطابق۔!

(آئینِ اکبری جلد 1 صفحہ 25)

کشمیر کو مشرق وسطیٰ، جنوب مشرقی ایشیا، شمالی ہند، روس، چین، تبت، عرب ممالک، اسرائیل، ترکی، مصر اور ایران کے ساتھ ملانے کے لئے 26 راستے ملاتے تھے۔ اسی طرح دوسرے کئی راستے تھے جو اپنی باہوں میں پگڈنڈیوں کا جال بچھائے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ گرمیوں اور کچھ سردیوں کے لئے نہایت موزوں تھے۔ انہی گمنام راستوں سے کشمیریوں کی رسائی پنجاب، لداخ، تبت اور افغانستان تک ہو سکتی تھی۔ شریف الدین یزدی کا کہنا ہے کہ بنیادی طور پر تین شاہراہیں کشمیر کو باقی دنیا سے ملاتی تھیں جن میں ایک کشمیر کو خراساں سے، دوسری ہندوستاں اور تیسری تبت سے۔ لیکن ظفر نامہ جلد اول صفحہ 180 میں اس کا ذکر آچکا ہے جس کے مطابق ہر راستہ اپنی باہوں میں کئی کئی اور راستے سموئے ہوئے تھے۔ سفرا اور سیاحوں نے صرف ان راستوں کا ذکر اپنے سفرناموں میں کیا ہے جن

کا کے اوپر سے وہ خود گزرے اور سفر کیا۔ جہاں سے وہ نہیں چلے ان کا ذکر کسی بھی جگہ موجود نہیں۔ جو بھی مقامی یا غیر مقامی لوگ جو ایک تو ناخواندہ ہوتے تھے اور سفر ناموں کی اہمیت سے لاعلم ہوتے تھے یا پھر اپنے مال مویشی لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتے۔ وہ نہ تو ان راستوں کا ذکر کرتے تھے جن پر وہ چل کر وہ آتے یا جاتے تھے یا ایسے مقامات کا ذکر جہاں انہوں نے عارضی قیام کیا۔ کرنل بوربیل نے اپنی کتاب رُوٹس آف جموں اینڈ کشمیر میں ایسے ہزاروں چھوٹے بڑے راستوں کا ذکر کیا ہے جن، پر مقامی یا غیر مقامی سیاح/مسافر/تاجر/حملہ آور آتے جاتے رہے ہیں۔ ایسی ایسی گزرگاہوں کا ذکر کیا ہے جہاں سے گزرنے کے دوران اکثر سیاحوں اور مسافروں کی جانیں تک چلی جاتی تھیں۔ ایسے ایسے پہاڑی درّوں، دشوار گزار گزرگاہوں کا ذکر کیا ہے جہاں آج چوڑی چوڑی پختہ سڑکیں تعمیر ہو چکی ہیں۔ جن پر ہر قسم کا زمینی ٹرانسپورٹ چل رہا ہے۔ ایسے ایسے پہاڑی درّوں، سنگلاخ چٹانوں، خوفناک گھنے جنگلات کے بیچ سے گزرتے راستوں خطرناک پہاڑی دریاؤں اور ندی نالوں، گلیشروں سے جان جوکھم میں ڈال کر گزرنے میں کامیاب ہونے والے لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ اور تذکرے پڑھ کر الف لیلیٰ ہزار داستان جیسی داستانیں یاد آ جاتی ہیں۔ جو دیومالائی اور آسیبی مخلوقات، خوفناک جنوں/بھوتوں/پریوں/دیوؤں اور مافوق الفطرت کرداروں سے جڑی ہوئی ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی سفار، سیاحوں اور تذکرہ نگاروں نے اپنی کتابوں میں چند اہم اور مشہور تجارتی راستوں کا ذکر کیا ہے جن میں جہلم ویلی روڈ (1869ء کے بعد) ۲۔پیر پنچال روڈ (مغل روڈ)، بانہال کارٹ روڈ، درّہ

توسہ میدان (چرار شریف، گلمرگ اور پونچھ کے کنڈی لورن سلطان پورہ کو ملانے والی سڑک)، درّہ زوجیلہ، گلگت ہنزہ اور شمالی علاقہ جات اور افغانستان کو ملانے والی گریز گلگت روڈ، K 2، نانگا پربت، کے راستے روسی ریاستوں، بلتستان، کافرستان، چترال کے ساتھ ملانے والی کپواڑہ کیرن اور ٹیٹوال لوات شاردا پیٹھ اور وادیٔ کشن گنگا (نیلم) کے ساتھ جوڑنے والے دو اہم راستے، ایک کیرن اٹھمقام سے رواٹ اور دوسرا راستہ مظفر آباد سے شاردا براستہ چیلا بانڈی، نوسیری وغیرہ۔

1947ء میں ریاست کی غیر فطری تقسیم کے بعد اب ریاست کے تین ڈیوژنوں کو جہلم ویلی روڈ، سونمرگ زوجیلہ لیہہ براستہ کرگل اور مغل روڈ، پیر کی گلی سرینگر سے پونچھ اور جموں کو جانے والی سڑک گل ملا کر تین گزرگاہیں۔ جہلم ویلی روڈ اوڑی کے آگے بند ہے۔ ڈکسم کشتواڑ اور توسہ میدان ۶ سے ۷ ماہ تک بند رہتی ہے۔

انہی گزرگاہوں اور راستوں پر چل کر مشاہیر تواریخ وادی میں تشریف لائے۔ ہمارے انہی پتھریلے راستوں پر بچھے ہوئے پتھروں اور برفانی تودوں اور گلیشروں نے ان کے تلوے چومے اور انہیں خوش آمدید کہہ کر اپنی مہمان نوازی اور پیار کا ثبوت دیا۔ انہیں اپنے کندھوں پر بٹھا کر فلک بوس پہاڑی چوٹیاں عبور کرائیں۔ خود بھوکے رہے لیکن ان کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ان میں سے بعض نے ان کی مہمان نوازی اور انسانیت کا بدلہ ان کا گلہ کاٹ کر دیا۔ وادیٔ کشمیر کی خصوصاً اور قلمروئے جموں و کشمیر لداخ بلتستان و شمالی علاقہ

جات۔

جب یہ دنیا کے نقشے پر ایک آزاد اور خودمختار سلطنت (پہلے) ملک کی حیثیت سے موجود تھا۔ اور باہر سے آنے والے سیاح اور سفیر یہاں آئے۔ حکومت سے اجازت نامہ حاصل کر کے ملک کی سرحدوں کے اندر داخل ہوتے تھے۔ ابوریحان البیرونی، ابن بطوطہ، ہیون سانگ جب واپس گئے تو انہوں نے سفر نامے تحریر کیے۔ جن میں نہ صرف سو فیصد سچائی بیان کی گئی ہے بلکہ اس خطۂ ارضی کی تعریفیں بھی کی گئی ہیں اور یہاں کے لوگوں کی بدحالی، غربت اور مشکلات کا ذکر غیر جانداری سے کیا ہے۔ خصوصاً یورپی اور چند مغربی ممالک سے آئے سیاحوں اور سفرا کے سفر ناموں سے وادی کی اصل تصویر ابھر کر آتی ہے۔ ان سیاحوں اور سفرا میں نکولس ہارڈی بھی نمایاں نام ہے۔

کشمیر کی آخری خودمختار ملکہ کوٹہ رانی کے آخری دنوں عبدالرحمان بلبل شاہؒ اور شاہمیر جیسے غیر ملکی سیاح خیر سگالی کے جذبات کے لے کر آئے اور اسلام کا پیغام یہاں کے باشندوں کو دیا۔ انہی راستوں سے چل کر حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ ایران سے تشریف لائے۔ وہ دو سے زیادہ مرتبہ آئے اور اپنے ہمراہ سات سو سے گیارہ سو سادات، علماء، مبلغین کو لائے۔ جو وادی کے اطراف واکناف میں سکونت پذیر ہو گئے۔ انہوں نے یہاں کے عوام کو ایک نیا دین تحفے کے طور پر دیا۔ اُن میں سے اکثر کی شادیاں یہیں ہو گئیں۔ وہ یہیں بس گئے۔ آج کے ان کے مزارات اور زیارت گاہیں باعث خیر و برکت بنی ہوئی ہیں۔ اس رعایت سے کشمیر کو ''پیر واٗر'' یا ''ریٚشہ واٗر'' بھی کہتے ہیں۔ انہی راستوں سے مغلوں اور

پٹھانوں نے زبردستی آ کر اس قلمرو کو اپنے قدموں سے پامال کیا۔ سب سے زیادہ سفار ایران، اسرائیل اور ترکی سے آئے جن کے مابعد کے آج تک وادی میں سکونت پذیر ہیں۔

اس کتاب کے ابتدائیہ میں ان تاریخی واقعات کا ذکر کرنا ہمارا مقصد نہ تھا لیکن راستوں اور گزرگاہوں اور سفرا کے حوالوں کی وجہ سے ان واقعات اور حالات کا تذکرہ لازمی بن جاتا ہے۔

شاردا فکروفن کے دریچے

شاردا رسم الخط کا نام ہے۔ یہ لکھائی کشمیر ہی میں معرض وجود آئی اور تقریباً ایک ہزار سال تک کشمیر میں مروج رہی۔ ایک رسم الخط کا ایک ہزار سے زیادہ برس مستعمل رہنا اپنے آپ میں بڑی بات ہے۔ جب سے یہ رسم الخط معرض وجود میں آیا تب سے کشمیر اور اس کے گردونواح کتنے ہی رسم الخط دیکھے۔ یہ رسم الخط آیے اور چلے گئے۔ آج کشمیر کا سارا ماضی اسی رسم الخط میں سمٹا ہوا اور محفوظ ہے۔ کتابیں اور پوتھیاں بھی ہیں اور بہت سے سنگ مزار بھی۔ یہ کہنا سچ اور صحیح ہے کہ اس کے اکشروں کی پہچان کے بغیر کوئی بھی شخص کشمیر کے ماضی میں اچھی طرح سے جھانک نہیں سکتا۔

بہت کم عرصہ گزرا جب سے یہ رسم الخط بدل گیا اور اس کی جگہ دیوناگری نے لی۔ میرے لڑکپن میں یہ رسم الخط اپنی آخری سانسیں گن رہا تھا لیکن ابھی اس میں دم خم باقی تھا۔ اصحاب نظر جانتے تھے کہ اس کا دم کبھی بھی نکل سکتا تھا اور وہ وقت بہت جلد آ گیا۔ ایک جھٹکے میں یہ رسم الخط مر گیا۔ ڈوگرہ دور میں کشمیر میں ناگری رسم

الخط کو کسی حد تک بڑھاوا ملا۔ شاردا اور دیوناگری میں کچھ عرصے تک مقابلہ آرائی ہوتی رہی لیکن انجام کار شاردا اس لڑائی میں ہار گیا۔ دیوناگری رسم الخط کے پاس ایسا بہت سا سامان تھا جو کہ شاردا کے پاس نہیں تھا۔ دیوناگری کے پاس ٹائپ والا چھاپ خانہ تھا اور اس کا دائرہ مقابلتاً کافی وسیع تھا۔ دیوناگری کی کتابیں سستی اور ہمہ وقت دستیاب رہتی تھیں جبکہ شاردا کتابوں اور پوتھیوں کو ہاتھ سے نقل کرنے کا زمانہ گزر چکا تھا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ شاردا کے لئے ٹائپ کا انتظام نہیں کیا جا سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ لکھائی ختم ہوگئی۔ آج پورے کشمیر میں شاید ہی کوئی ہوگا جو اس رسم الخط سے پوری طرح واقف ہو۔ کشمیر سے باہر بعض بڑے بوڑھے اس کو تھامے ہوئے ہیں لیکن وہ بھی تیزی سے اس دنیا سے رُخصت ہو رہے ہیں۔

یہ لکھائی آج یادگارِ ماضی بنی ہے۔ کشمیر ایسی یادگاروں سے مالا مال ہے اور یہ یادگار ایسی شاندار ہے جیسے مارتنڈ کے عظیم الشان کھنڈرات۔ اس میں ایسی روایتیں ہیں جیسے ہمارے ہاں علمی، ادبی اور فنی روایتیں ہیں۔ اگرچہ اس لکھائی کا جنم کشمیر میں ہوا لیکن اس کی عظمت کشمیر تک ہی محدود نہیں رہی۔ یہ لکھائی لداخ جا پہنچی اور وہاں سے تبت چلی گئی۔ لداخ میں کہیں کہیں اس کے کتبے ادھر اُدھر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہمارے لداخی بھائیوں نے اس کو دیکھ کر ہی اپنی لکھائی تیار کی جو آج کل بھی مروج ہے۔ اس میں دو 2 نئی باتیں یہ ہیں کہ لداخ اپنے مقدس منتر ''اوم سنہ بدم ھم'' آج بھی شاردا اکشروں میں ہی لکھتے ہیں اور ان کے جاتم پہلے شاردا میں اس کے بعد نئے تبتی اور لداخی اکشروں میں لکھے جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا کہ لداخ میں شاردا لکھائی کو اتنا مقدس سمجھا جاتا ہے۔

کشمیر کے جنوب میں یہ لکھائی جموں پہنچی اور اس کے گرد و نواح میں پھیل گئی۔ اسی سے ہی ٹاکری اور لہندی نکلی، وہاں سے یہ لکھائی پنجاب کے شمال میں گئی اور اسی سے ہی گورمکھی کا جنم ہوا۔ گلگت سے یہ پامیر پہنچی اور کشتواڑ کے راستے کانگڑہ۔ ان علاقوں میں اب بھی اس کی باقیات ملتی ہیں۔

اس لکھائی کا جنم سنسکرت کے لئے ہوا تھا۔ اس کی مختلف شاخیں نکلیں اور یہ سنسکرت کا پوری طرح سے احاطہ نہیں کرسکی۔ لداخیوں نے اسے سے ہی اپنی لکھائی بنائی۔ اس سے گورمکھی بھی نکلی اور وہ بھی پنجابی زبان کے لئے کام کرگئی لیکن یہ کشمیری زبان کے مکمل رسمِ خط کی جگہ نہیں لے سکی۔ البتہ اس کا دائرہ مذہبی اموراور سنسکرت کے مذہبی لٹریچر کے لئے ہی رہا جو کہ کشمیری پنڈتوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جب یہ لکھائی پروان چڑھ رہی تھی اُن ہی ایام میں کشمیری سیاسی بھونچال آئے اور نئے تغیرات میں اس لکھائی کا دائرہ متعین سا ہوگیا۔ اگرچہ اس لکھائی میں کسی قدر کشمیری بھی لکھی گئی لیکن کشمیری زبان کا مکمل رسمِ خط بنانے کی سنجیدہ کوشش کبھی نہیں ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں کشمیریوں کو بھی کشمیری کا غم نہیں تھا۔ حال ہی میں کشمیریوں نے اس بابت اقدامات شروع کئے لیکن اتنے وقت میں پنجابی اور لداخی رسمِ خط اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس رسمِ خط کو کشمیری میں سمونے کے لئے اس میں کچھ تبدیلیوں کی کوشش کی گئی۔ یہ مقبول عام نہیں ہوسکی کیونکہ اس کو کبھی بھی شاہی سرپرستی حاصل نہیں رہی۔ جیسا کہ قبل ازیں تذکرہ کیا جاچکا ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی میں کشمیر میں ایک زبردست سیاسی بھونچال آیا جس سے یہاں کا ذرہ ذرہ ہل گیا۔ ایک جھٹکے

میں فارسی زبان رائج ہوئی۔ فارسی، نستعلیق اور شاردا رسمِ خط کا آپس میں کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا کیونکہ فارسی میں جہاں بانی تھی اور شاردا محدود۔ لیکن چونکہ اس کی بنیادیں یہاں کی مٹی میں تھیں اس لئے فارسی لکھائی اور شاردا ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ چلتی رہی۔ آہستہ آہستہ سنسکرت کا رواج کم ہونے لگا اور کشمیری پنڈتوں میں ایک ایسا دور بھی آیا جس نے سنسکرت سے اپنا دامن چھڑا لیا۔ دھرم کی بڑی بڑی کتابیں فارسی ترجمے کی صورت میں پڑھی جانے لگیں۔ دَھو دَھا کے کرم کنڈ سنسکرت میں رہا اور یہ پیشہ ور پنڈتوں کے ہاتھ میں رہا۔ اس ایک چیز نے کشمیری پنڈت اور پنڈت دھرم زندہ رکھا اور کسی حد تک 'شاردا' لپی کو بھی۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا شاردا کی جگہ دیوناگری نے لی۔

تواریخ کی ورق گردانی کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ابھی تک کوئی حتمی تحقیق سامنے نہیں آتی ہے کہ شاردا حروف تہجہ کب وجود میں آئے۔ یہ کس نے بنائے اور اس سے قبل کشمیر میں کون سی لکھائی تھی اور شاردا لکھائی کی وجہ تسمیہ کیا بنی۔ ہماری کسی بھی پوتھی اس حقیقت کی نقاب کشائی نہیں کی گئی ہے۔ بعض حوالے ایسے بھی ہیں جو ہمیں کسی منطقی نتیجے تک پہنچا سکتے ہیں۔

روایت ہے کہ کسی زمانے میں کشمیریوں کا رسم الخط کھو گیا۔ جب ایسا ہوا تو وہ بہت گھبرا گئے۔ کرم کنڈ خطرے میں پڑ گیا۔ دھرم کانت ہونے لگا۔ بعض بوڑھے اٹھے انہوں نے ماتا کی سخت ریاضت کی۔ جب وہ مہرباں ہوئی تو اس نے ان سے کہا۔ ''مانگو'' جواب ملا۔ ہمیں اکشر دیجئے۔ شارکا بھگوتی نے ایک مینا کی شکل اختیا کی اور زمین پر اپنی چونچ سے بعض اکشر لکھے۔ وہاں موجود لوگوں نے اسی کے تتبع

میں اکشر لکھے اور یہی شاردا لپی بن گئی۔

یہ روایت بڑی الجھی ہوئی ہے۔ اسے سن کر کئی سوال اٹھتے ہیں۔ ایک یہ کہ اکشر شارکا نے لکھے۔ اس کا نام شاردا کیسے پڑا؟ اگر انہوں نے شاردا کی استوتی کی تھی تو وہ کیسے مینا بن گئی؟ مینا بننا شکار سے منسوب ہے اور شارکا کے بسیر کو آج بھی ہاری پربت کہا جاتا ہے۔ ('ہاَرْ' کشمیری میں مینا کو کہا جاتا ہے)۔ شارکا علم کی دیوی نہیں۔ شاردا سچ مچ تحریر کی دیوی تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کی عظمت میں پاٹھ میں کہا جاتا ہے۔ ''کتاب ہاتھ میں لینے والی دیوی'' اور ہندوستان میں قلم کی پوجا کرتے وقت شاردا دیوی کا دھیان کیا جاتا تھا۔ کشمیر میں شاردا دیوی کا مٹھ کپوارہ میں ہے۔ اس کا عظیم الشان تیرتھ اور مٹھ کرناہ علاقے میں ہے جسے شاردا کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں کشمیر کو شاردا پیٹھ کے نام سے جانا جاتا تھا۔

آج کل کہا جاتا ہے کہ شاردا تیرتھ کے سام سے ہی اس رسم الخط کا نام شاردا پڑا۔ بعض لوگ اور بھی پیش قدمی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ رسم الخط وہیں تیار کیا گیا لیکن ان باتوں کی پشت پناہی بہت کم ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تحریر کی دیوی کا نام شاردا تھا لہٰذا اس لکھائی کا نام اسی نسبت سے پڑا۔

اس کے بعد اکشروں کے گم ہونے کی بات ہے۔ قدرتی امر ہے کہ یہ خیال در آتا ہے کہ یہ اکشر کون سے تھے اور یہ کب کھو گئے۔ ان دونوں سوالوں کے جواب میں کافی وقت لگے گا اور ہمیں قدیم تواریخ کو از سر نو کھنگالنا پڑے گا۔

سب سے پہلے سوال ہے کہ شاردا اکشروں سے قبل یہاں کون سے اکشر رائج تھے۔ اس بات کا جواب اشوک کے کتبے دیتے ہیں۔ اس کے زمانے میں اٹک دریا

کے اس پار ہندوستان میں براہمی خط کا چلن تھا۔ کشمیر کے لوگوں کے لئے اشوک نے کشمیر میں کوئی کتبہ نہیں لکھا۔ اس کی وجوہات بہت سی ہوسکتی ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس نے ہمارے لئے اپنے اپدیش لکھے لیکن وہ مظفرآباد کے اس پار سے دستیاب ہوئے ہیں۔ اس جگہ جسے آج شہباز گڑھی کہتے ہیں۔ اگرچہ شہباز گڑھی خود اس عزت افزائی کے قابل نہیں تھی لیکن اس کی بڑھائی بات میں تھی کہ ایک بہت بڑی اور رفیع الدرجات یاترا کا ایک پڑاؤ تھا۔ یہ یاترا وہاں سے تھوڑی دور ایک گاؤں میں لگتی تھی جسے بریری کہا جاتا تھا اور جہاں بریری بھگوتی کا تیرتھ تھا۔

جب ہم 'بریری' بھگوتی کے نام پر غور کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہی بھگوتی ہے جسے کشمیری آج بھی 'بڑ اَر' کہتے ہیں۔ اور یہ نام ہمارے بعض گاؤں میں اب بھی موجود ہے۔ 'بڑ ارِ آنگن'، 'بڑ ارِ نمبل' اور 'وچہ بڑ ور' (بجبہاڑہ) وغیرہ نام اس کے ثبوت ہیں۔ بجبہاڑہ میں ایک کریوے کا نام اس وقت بھی 'بڑ اری ماں کے پاس' ہے۔ یہ 'بڑ اَر' لفظ سنسکرت میں مستعمل نہیں لیکن کشمیر میں زمانہ قدیم سے مروج ہے۔ 'بڑ اری ماں' کے اس تیرتھ پر کشمیری بھی جاتے ہوں گے۔ کشمیر سے وہاں جانے کا راستہ بارہمولہ سے جہلم کے دائیں کنارے ہوکے جاتا ہے۔ یہ راستہ بھی نہایت قدیم ہے اور مشہور چینی سیاح ہیون سانگ اسی راستے سے کشمیر میں داخل ہوا تھا۔

اس سے ہم یہ اخذ کرسکتے ہیں کہ شہباز گڑھی کا کتبہ کشمیریوں کے لئے بھی تھا۔ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ شہباز گڑھی کے یہ کھروشٹی حروف تہجی بنیادی طور ایران سے آئے تھے۔ جب قدیم ایرانی شہنشاہوں نے ہندوستان کے مغربی

حصوں کو زیر کیا تو عین ممکن ہے کہ کشمیر بھی ان کے ہاتھوں پڑا ہو۔

کشمیر میں کھروشٹی اکشروں اور لکھائی کے نمونے کھر ہامہ اور ہارون کے میں ملتے ہیں۔ کھر ہامہ میں دستیاب کھروشٹی کے کتبے ابھی تک پڑھے نہیں جاسکے ہیں لیکن ہارون کے کھروشٹی کے کتبوں میں درج گنتی کسی حد تک پڑھی جاسکی ہے۔ یہ کشان بادشاہ کنشک کے وقت کے ہیں۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ شاردا لکھائی سے قبل کشمیر میں کھروشٹی لکھائی کا چلن تھا۔ کنشک کے وقت تک ان اکشروں کے آچار ملتے ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس وقت کون سا ایسا انقلاب رونما ہوا جس میں لوگ یہ اکشر بھول گئے یا وہ 'گم' ہو گئے۔ تواریخ کے اوراق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی انقلاب ہے جو مہر گل کے ہاتھوں ساتویں صدی عیسوی میں رونما ہوا۔

مہر گل کے ظلم وستم کی داستان اتنی زیادہ اور اتنی مشہور ہے کہ اس کا ازسر نو تذکرہ وقت کی بربادی ہے۔ اس نے یہاں کے مندروں کو تاراج کیا۔ کبھی وہ 'شیو' بن گیا۔ کس لئے؟ صرف ویشنو مندروں اور برہمنوں کو تباہ کرنے کے لئے۔ وہ ہر اچھی چیز خاص طور علم وادب کا سخت ترین دشمن تھا لہٰذا اگر اکشر 'گم' ہونے کی روایت سچ ہے تو یہ تماشہ انہی دنوں رونما ہوا ہوگا اور اس کے مرنے کے بعد ہی شاردا لکھائی نے جنم لیا ہوگا۔

اس کے متعلق ایک اور بات لائق تذکرہ ہے راجہ ہرش وردھن کے دستک آثار قدیمہ کے اہلکاروں کو ہندوستان میں بعض مقامات پر دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ پتھروں پر کندہ ہے اور ان پر لکھا گیا ہے، ''سوہستو قم...... ہرشیسہ''۔ یہ عبارت

سنسکرت زبان میں ہے لیکن اکشر شاردا میں ہیں۔ یہ درست ہے کہ قدیم اور اس کے بعد لکھی جانے والی شاردا میں کسی قدر فرق ہے اور یہ بات قابل فہم بھی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہرش وردھن کشمیر کا حکمران نہیں تھا لیکن سمجھا جاسکتا ہے کہ اس کے دور میں شاردا لکھائی کشمیر سے باہر دور دور تک پھیل گئی تھی۔

اس کتبے کے بعد قابل ذکر مہرانی دیداہ کا وہ کتبہ ہے جو آج کل لاہور کے عجائب گھر میں ہے۔

اس بات کا تذکرہ پہلے ہی آیا ہے کہ اٹک کے اس پار ہندوستان میں کھروشٹی لکھائی کے بدلے براہمی لکھائی کا چلن تھا۔ البتہ یہ لکھائی کشمیر میں نہیں آئی۔ یہاں کہیں بھی زبان میں لکھا گیا کوئی کتبہ دستیاب نہیں ہوسکا ہے نہ کوئی کتاب ہی دستیاب ہوسکی ہے۔ اس لئے یہ بات باعث تعجب ہے کہ شاردا رسمِ خط اسی کے نمونے سامنے رکھ کر وضع کی گئی نہ کہ کھروشٹی رسم الخط کو زیر نظر رکھ کر۔ یہ بات یوں پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے۔

۱۔ براہمی لکھائی کی طرح شاردا لکھائی ہے۔ ''اُ'' اور ''او'' آوازیں دکھانے کے لئے نشان اچھروں کے نیچے لگائے جاتے ہیں۔ دیگر اعراب شاردا میں اچھروں کے دائیں بائیں لگائے گئے۔ براہمی میں الفاظ کے اوپر لگائے جاتے تھے۔

۲۔ براہمی کی طرح شاردا لکھائی بائیں سے دائیں لکھی جاتی تھی۔

شاردا لکھائی کی بڑائی اور اس کی مختصر تواریخ رقم کرنے کے بعد اس لکھائی کی بعض باریکیوں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

ایک خاص بات جو کہ قابل توجہ ہے وہ یہ کہ اس لکھائی کی اولین تربیت کی ابتداء خاص مذہبی تقریب سے کی جاتی ہے۔اس کو ''دوآرمبھ'' کہتے تھے۔برہمن ایک خاص مہورتھ پہ آتا تھا اوت صاحب خانہ کے بچوں کو اس کے اکشر سکھاتا تھا۔اس کے بچے ہاتھ پکڑ کر ان اکشروں پر بچے کی تقطیع کرائی جاتی تھی۔اس موقع پر گیت گائے جاتے تھے۔یہ صحیح ہے کہ یہ تمام کام کچھ منٹوں ہی میں ختم ہو جاتا تھا لیکن اس شُبھ آرمبھ کے بعد اصلی کام شروع کیا جاتا تھا۔

شاردا کتبے

یہ بات عیاں ہے کہ کشمیر دور قدیم ہی سے علم ادب کا گہوارہ رہا ہے۔جو بھی قدیم لٹریچر کسی نہ کسی صورت میں ہم تک پہنچا ہے وہ شاردا لپی میں ہے جبکہ ایک ہزار سال سے زائد عرصے تک کشمیر میں پوری آب و تاب کے ساتھ مروج رہی۔اسی مناسبت سے کشمیر کو شاردا پیٹھ یا شاردا دیش کہتے ہیں۔کتابیں لکھنے کے ساتھ ساتھ یہاں اہم اور موزوں مقامات پر ہزاروں کتبے نصب کئے گئے تھے جو اب نیست و نابود ہو چکے ہیں یا کہیں ایک آدھ ٹوٹی پھوٹی شکل میں دستیاب ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب کشمیر میں ایسے کتبے جگہ ایستادہ تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مہاراجہ اشوک کی الاٹ یا اشوک چکر جگہ جگہ ایستادہ تھے۔کلہن، راج ترنگنی کے ترنگ،اشلوک ۱۵ میں کہتا ہے کہ راج ترنگنی کی تالیف سے قبل اس نے ان تمام کتبوں کا مطالعہ کیا،نہیں تو بقول اس کے، یہ تصنیف مکمل نہیں ہو پاتی۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کتبوں کی کتنی اہمیت تھی۔

'شاردا' لپی میں پتھروں کی سلوں پر کندہ کتبے جو وادی کشمیر کے

مختلف منادر اور ہیر پیٹھ مراکز میں موجود ہیں۔ یہ ان مقامات تک کیسے پہنچے یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن قیاس کیا جا رہا ہے 'شاردا جی' پیٹھ کے درشن کرنے والے زائرین وہاں سے بڑی بڑی سلوں کو توڑ کر کتبے والے حصوں کو وہاں سے اٹھا کر لے آئے ہیں۔ ایسے کئی پتھر کے ٹکڑے شاردا پیٹھ کے اندر اور باہر آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ جو بڑی بڑی سلوں کے باقیات ہیں۔ راقم الحروف نے ایسی ٹوٹی پھوٹی سلیں مندر کے آس پاس پڑی دیکھی ہیں۔ جن پر کوئی تحریر نہیں۔ لیکن لگتا ہے کہ تحریر والا حصہ توڑ کر لے جایا گیا ہے۔ جیسا کہ میں نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ماہرین آثار قدیمہ اور مؤرخوں نے شاردا پیٹھ سے کچھ کتبے اور مورتیاں وہاں سے لے جا کر لاہور، متھرا اور سرینگر کے عجائبات خانوں میں لے جا کر رکھی ہیں۔ پنڈت اوتار کرشن رازداں (ماہر آثار قدیمہ و مؤرخ) نے اپنی تحقیق 'شاردا کتبے ہماری تاریخ کے سنگ میل' میں تحریر کیا ہے کہ ''شاردا کتبے آرہ گام ضلع بڈگام، تاپر (بارہمولہ) سابقہ نام پرتاب پور، کوٹہ ہار ضلع اننت ناگ، کھنموہ بیج بہاڑہ (اننت ناگ)، زجی لے (ڈوڈہ)۔ 1

1 شاردا کتبے ہماری تاریخ کے سنگ میل (اوتار کرشن رازداں)

ہاری پربت سرینگر شہر کے بیچ واقع ہے۔ اس پہاڑی پر حضرت بہاؤالدین صاحب کی مشہور زیارت ہے۔ اس زیارت کے احاطے میں بھی کئی ایسی قبریں ہیں

جن پر شاردا میں کتبے تحریر ہیں۔ کتبے میں سلطان محمد شاہ کے دور حکومت میں تخت سلیمانی (موجودہ شنکراچاریہ) کے دامن جنگ کا ذکر ہے۔ جس میں ابراہیم کے فرزند سید خان کو ہلاک کیا گیا ہے۔ یہ کتبے کی عبارت تھی۔ کتبے پر تاریخ درج ہے۔ (۴۲) ۶۰ ساون کی اماوس، شکروار مطابق ۹ جولائی ۱۴۸۴ء۔ یہ وہ تاریخ ہے جب یہ جنگ ختم ہوئی۔ ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ راجہ ہرش وردھن کے دستخط آثار قدیمہ کے اہلکاروں کو ہندوستان میں بعض مقامات پر دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ پتھروں پر کندہ ہے اور ان پر لکھا گیا ہے۔ ''سوہستوقم...... ہرشیہ''۔ یہ عبارت سنسکرت زبان میں ہے۔ لیکن اکثر شاردا میں ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ قدیم اور اس کے بعد لکھی جانے والی شاردا میں کسی قدر فرق ہے اور یہ بات قابل فہم بھی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہرشوردھن کشمیر کا راجہ نہیں تھا لیکن سمجھا جاسکتا ہے کہ اس کے دور میں شاردا لکھائی کشمیر سے باہر دور دور تک پھیل گئی تھی۔ اس کتبے کے بعد قابل ذکر مہارانی دیداہ کا وہ کتبہ ہے جو آج کل لاہور کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ 2

2 شاردا کتبے ہماری تاریخ کے سنگ میل، مضمون شائع شدہ (شیرازہ اردو)
مصنف (اوتار کرشن رازداںؔ)

راز دان کہتے ہیں کہ کشمیر کا جو قدیم لٹریچر کسی نہ کسی صورت میں ہم تک پہنچا ہے وہ سب شاردا لپی میں ہے۔ جو کہ ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے تک کشمیر میں

پوری آب وتاب کے ساتھ مروج رہی ہے۔ اسی مناسبت سے کشمیر کو شاردا پیٹھ یا شاردا دیش کہتے ہیں۔ وہ وقت بھی تھا جب کشمیر میں ایسے کتبے جگہ جگہ ایستادہ تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مہاراجہ اشوک کی لاٹھ یا اشوک چکر جگہ جگہ ایستادہ تھے۔ کلہن، راج ترنگنی کی ترنگ اشلوک ۱۵ میں کہتا ہے کہ راج ترنگنی کی تالیف سے قبل اس نے ان تمام کتبوں کا مطالعہ کیا۔ نہیں تو بقول اس کے یہ تصنیف کبھی مکمل نہیں ہو پاتی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کتبوں کی کتنی اہمیت تھی۔

مہارانی 'دیدآہ' کشمیر کی ایک نامور حکمراں تھی۔ ان کے عہد سے وابستہ دو شاردا کتبے دستیاب ہیں۔ ان میں سے ایک کتبہ سرینگر کے ایس پی ایس میوزیم میں موجود ہے۔ یہ کتبہ بدھ اوتار پدم پائی کی پیتل کی مورتی پر کندہ ہے۔ دوسرے شاردا کتبے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بہت عرصے تک ایک کشمیری پنڈت گھرانے میں محفوظ تھا۔ بعد میں اسے لاہور کے عجائب گھر پہنچا دیا گیا۔

ایک ٹوٹا پھوٹا کتبہ ہمارے گھر میں تھا۔ جو میرے دادا جان کو ''ہنڈی'' میں پرانے کھنڈرات کی کھدائی کے دوراں ملا تھا۔ یہ کتبہ کم سے کم 50 سال ہمارے گھر کی ایک الماری (کوٹھار) میں پڑا رہا۔ اسے دیکھنے کے لئے میرے کچھ اساتذہ سروپ ناتھ رینہ، راج ناتھ بھان، محمد یعقوب قریشی دیکھنے کے لئے آئے۔ محمد یعقوب قریشی نے میرے دادا سے درخواست کی وہ اس کتبے کو سکول کی لائبریری کے لئے وقف کر دیں لیکن دادا مرحوم نے انکار کر دیا۔ پتہ نہیں یہ کتبہ پھر کہاں رکھ دیا گیا۔ اس کے ساتھ مہاتما بدھ کی پتھر کی ایک مورتی جو 3x6x10 انچ تھی۔ جو آج تک میرے پاس موجود ہے جو ہمیں گھر کے نزدیک

ایک کھیت میں پڑی ملی تھی۔ مہارانی دیداہ دورِ حکومت میں ان کتبوں پر لوگک اور سپت ریشی سنوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان کتبوں کے لکھنے کا سنہ بالترتیب ۹۸۹ عیسوی اور ۹۹۲ عیسوی بنتا ہے۔ یہ دونوں سال مہارانی دیداہ کے دورِ حکومت سے تعلق رکھتے ہیں جس نے ۹۸۰ء سے ۱۰۰۳ء تک کشمیر پر حکومت کی۔ ۱؎

مجھے یاد نہیں کہ حال ہی میں کسی کتاب میں مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ کشمیری زبان کا موجودہ رسم الخط اٹھارویں صدی عیسوی سے رائج ہوا۔ اس سے پہلے کشمیری کا رسم الخط شاردا ہی تھا۔ یہ انکشاف کسی کشمیری محقق (مصنف) نے ''شیرازہ'' اردو کے ایک شمارے میں کیا ہے۔

۱؎ راج ترنگنی (پنڈت کلہن)

لیکن اسے ستم ظریفی کہیں یا بدقسمتی کہ آج کل ہمارے پاس ان مین سے اکثر کتبے دستیاب نہیں۔ جو کچھ بچا ہے وہ شکستہ حالت میں ہے۔ برسبیل تذکرہ اس بات کو تحریر کرنا لازمی ہے کہ کتبوں کی سورت میں جو کچھ بھی ہمارے پاس بچا ہے وہ صرف کشمیر میں ہی دستیاب نہیں بلکہ ان میں سے بعض لاہور، پشاور، لندن اور امریکہ کے عجائب گھروں میں رکھے گئے ہیں۔ یہ کتبے وہاں کیسے پہنچے اور ان پر کون سی عبارت درج ہے اس پر ابھی کوئی تحقیق نہیں کی گئی ہے۔ فی الحال اس مضمون میں، میں اُن شاردا کتبوں کے متعلق خامہ فرسائی کروں گا جو کشمیر اور اس کے گردو

نواح میں دستیاب ہوئے ہیں۔

مہارانی 'دیداہ' کشمیر کی ایک نامور حکمران تھی ۔ ان کے عہد سے وابستہ دو شاردا کتبے دستیاب ہیں۔ ان میں سے ایک کتبہ سرینگر کے ایس پی ایس میوزیم میں موجود ہے۔ یہ کتبہ بدھ اوتار پدم پائی کی پیتل کی مورتی پر کندہ ہے۔ دوسرے شاردا کتبے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بہت عرصے تک ایک کشمیری پنڈت گھرانے میں محفوظ تھا۔ بعد میں اسے لاہور کے عجائب گھر پہنچادیا گیا۔ کہتے ہیں کہ یہ ابھی وہاں محفوظ ہے۔ جہاں تک اول الذکر شاردا کتبے کا تعلق ہے اس پر لکھا ہے کہ یہ مہارانی دیداہ کے وقت کا، سموت ۶۵ ساون کے چاند والے پکھواڑے پدم پانی کی یاد میں نصب کیا گیا۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگرچہ مہارانی دیداہ کے دور حکومت میں یہاں ہندو دھرم کا چلن تھا لیکن بدھ دھرم بھی ایک زندہ وجاوید حقیقت کے روپ میں موجود تھا۔

دوسرا شاردا کتبہ ٹوٹی پھوٹی حالت میں ہے اور اس کے کچھ حصے دستیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ یہ کشمیری دِوری پتھر کا ہے اور اس پر ایک شخص کا نام کندہ ہے جو اپنے وقت کا درویش رہا ہوگا۔ اس کا نام دھرما نک تھا جس نے اپنے اچھے کاموں سے اپنی ماں کا دل خوش کیا۔ اپنی ماں کا نام زندہ رکھنے کے لئے اس نے اپنے مذہب کے کاموں کا ذکر کیا ہے کیونکہ اس کی ماں ان سے متاثر ہوتی تھی لیکن بدقسمتی سے یہ بات عیاں نہیں کہ وہ کون سے مذہبی کام تھے جن سے اس کی ماں متاثر ہوئی تھی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس حصے پر درج ہے جو اب ٹوٹ کے ضائع ہوچکا ہے۔ البتہ یہ بات طے ہے کہ کتبہ سموت ۶۸ شچی سال میں لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر بہلر

اس کے متعلق یہ بھی کہتا ہے کہ اس پر کشمیری میں رانی دیداہ کا فرمان کندہ ہے لیکن ساتھ یہ کہہ کر اپنا مؤقف بدلتا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ اس پر شاردا میں کچھ سنسکرت حروف کندہ ہیں۔

ان کتبوں پر لوکک اور سپت ریشی سنوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان کتبوں کے لکھنے کا سنہ بالترتیب ۹۸۹ عیسوی اور ۹۹۲ عیسوی بنتا ہے۔ یہ دونوں سال مہارانی دیداہ کے دور حکومت سے تعلق رکھتے ہیں جس نے ۹۸۰ء سے ۱۰۰۳ء تک کشمیر پر حکومت کی۔ کلہن نے بھی اپنی تصنیف راج ترنگنی میں مہارانی دیداہ کی حکومت کا وقت یہی درج کیا ہے۔

اگر ان دونوں کتبوں کی تواریخی اہمیت پر غور کیا جائے تو ان کی کوئی انتہا نہیں۔ ان پر مہارانی دیداہ کا ذکر ایک خاتون کی حیثیت میں نہیں کیا گیا ہے بلکہ اُسے کشمیر کا ''مردِ مجاہد'' بتایا گیا ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ اُس وقت دیدا نے لوگوں کے دلوں میں نہ صرف ایک مہارانی کے روپ میں جگہ بنائی تھی بلکہ لوگ اُسے ایک بہادر، ہوشیار اور چالباز خاتون سمجھتے تھے جس نے بہت ہی سخت حالات میں حکومت کا نظام سنبھالا اور قریب پچاس برس تک کشمیر کے تخت پر براجماں رہی۔ ان کتبوں سے کشمیر میں اُس وقت کی مذہبی رواداری پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ لاہور میوزیم میں موجود شاردا کتبہ، بھگوان وِشنو کی پرارتھنا سے شروع کیا گیا ہے۔ اس یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ کشمیر میں دسویں صدی عیسوی میں وِشنومت کا چلن رہا ہے۔ دوسری طرف پدم پانی کی مورتی کا کتبہ یہاں بودھ دھرم کی بحالی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کی طرف ایک اور بات اشارہ کرتی ہے

کہ پدم پانی کی مورتی برہمنوں کی طرح زُنار پہنے ہوئے دکھائی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں دھرمون سے زیادہ یہاں برہمن مت کا چلن رہا ہوگا۔

دچھن

دور قدیم میں بھی کشمیر کی سرحدیں کشتواڑہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جو کہ آج کل صوبہ جموں کا حصہ گردانا جاتا ہے۔ کشتواڑ کا ایک دور دراز گاؤں دچھن ہے۔ جہاں راجہ اننت دیو سے منسوب ایک شاردا کتبہ دستیاب ہوا ہے۔ اس کتبے پر "ننت دیو" کندہ ہے جو کہ اصل میں اننت دیو ہونا چاہئے جس نے کشمیر پر ۱۰۲۸ء سے ۱۰۳۲ء تک حکومت کی۔ کتبے پر لوکک یا ۱۰۳۶ء درج ہے جو کہ راجہ اننت دیو کا زمانہ ہے۔

کتبے پر راجہ اننت دیو کے بغیر اور کسی بھی بات کا ذکر نہیں۔ البتہ اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اننت دیو کے وقت دچھ علاقہ کشمیر کا حصہ رہا ہے۔ اس کو یہ بات بھی تقویت پہنچاتی ہے کہ راجہ نے چمبہ علاقہ بھی فتح کیا تھا جس کا ذکر کلہن، راج ترنگنی میں ترنگ ۷، شلوک ۲۱۸ میں کرتا ہے اور اس وقت چمبہ جیسا علاقہ فتح کرنا تب ہی ممکن تھا جب کشتواڑ کو فتح کیا جاتا ہے۔

فوٹو D

کتبہ بخطِ شاردا سنسکرت، متصل دو آب گاہ سوپور   بعدِ مہاراجہ جے سنگ والی کشمیر ۲۵ لوکک مطابق ۱۱۴۹ء

فوٹو E

کتبہ خطِ نسخ و ثلث۔ سر دروازہ مسجد شریف حضرت سید محمد ولی مدنیؒ سرینگر
یہ کتبہ دچھن واسیوں کی سماجی زندگی کا حصہ بن چکا ہے کیونکہ گپت کا ذکر ہے جس نے وہاں کے لوگوں کی آسائش کے لئے ایک پُل کا کام مذکورہ مہم گپت کی نگرانی میں پایہ تکمیل تک پہنچا تھا۔ کتبہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے کتبے کی عبارت پڑھنے میں دقتیں آرہی ہیں۔

آرِگام

آری گام ضلع بڈگام کا ایک گاؤں ہے۔ وہاں بھی ایک شاردا کتبہ دستیاب ہوا ہے جو اب سرینگر کے سری پرتاپ میوزیم میں رکھا گیا ہے اس میں درج ہے کہ براڑ گاؤں یا آج کل کے آری گاؤں میں گنگیشور کے نزدیک رام دیو نے مہاتما ایکشوری کی مورتی کی ستھپنا کیلئے لکڑی کا مندر بنوایا تھا۔ بعد میں یہ مندر ایک راجہ نے نذر آتش کیا جسے سہم کہتے تھے۔ اُس کے بعد کل دیو نے اسی مورت کیلئے ایک اور مندر بنوایا جو پتھروں اور اینٹوں کا تھا۔ اس مندر کو للک سنہ ۴۲ ماگھ، چاند والے پکھواڑے کے پانچویں دن، مطابق ۱۶ نومبر ۱۱۹۷ کو بنایا گیا۔ لگتا ہے کہ سہم نامی راجہ، راجہ جے سہم رہا ہوگا جس کے دور حکومت میں بقول کلہن، پورا بڈگام علاقہ نذرِ آتش ہوگیا۔ ہوسکتا ہے کہ اس آگ کی لپیٹ میں یہ مندر بھی آیا ہوگا۔

جہاں تک کشمیر کی تواریخ کا تعلق ہے یہ شاردا کتبہ بہت اہم ہے کیونکہ اس سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ بارھویں صدی عیسوی تک کشمیر میں بدھ دھرم کا اچھا

خاصا اثر و نفوذ تھا۔

تاپر

تاپر بارہمولہ ضلع کا ایک گاؤں ہے جس کا قدیم نام پرتاپ پور تھا۔ وہاں بھی ایک شاردا کتبہ دستیاب ہوا ہے جو سرینگر کے ایس پی ایس میوزیم میں موجود ہے۔ کتبہ ٹوٹی پھوٹی حالت میں ہے اور اس میں گج راج کے فرزند گنگ کے ہاتھوں پرمانڈ دیو کے دور حکومت لوکک سنہ ۴۳ مطابق ۱۱۵۶ء میں ایک مندر کی تعمیر کا ذکر ہے۔ اگر چہ یہ کتبہ کوئی خاص جانکاری فراہم نہیں کرتا لیکن اس کو دیکھنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ راجہ مانڈ دیو کون تھا؟ کشمیر کی تواریخ میں اس دور میں کسی بھی راجہ کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ البتہ جون راج لکھتا ہے کہ مذکور دور میں کشمیر میں پرمانک نام کا ایک راجہ تھا جو جے سمہا کا فرزند اور ولی عہد تھا۔ اُدھر کلہن لکھتا ہے کہ جے سمہا کا ایک فرزند تھا جس کا نام درمانڈی تھا جو اس کے تخت کا وارث بھی تھا۔ قرینِ قیاس ہے کہ پرمانڈ دیو، درمانڈ دیو کے نام سے کوئی راجہ رہا ہوگا۔

نیج بہاڑہ

کشمیر میں باہر سے بہت سے عالم، فاضل اور ماہرین آچار قدیمہ آئے ہیں جن میں سر جان مارشل ایک بہت ہی قابل تعظیم نام ہے۔ مارشل ۱۹۰۸ء میں کشمیر آیا اور یہاں نیج بہاڑہ کے نزدیک ایک شاردا کتبہ دریافت کیا۔ اس کتبے پر راج دیو کا ذکر ہے۔ جون راج نے اپنی راج ترنگنی میں اس راجہ کا مفصل ذکر کیا ہے۔ کہا

جات ہے کہ یہ راجہ جگد یو کا فرزند اور ولی عہد تھا جس نے ۱۲۱۳ء سے ۱۲۲۶ء تک کشمیر پر حکومت کی۔ کتبے میں ایک اور بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس پر کندہ ہے کہ بدھ مت کے کسی پیروکار جس کا نام کمل تھا، لوکیشو بٹارک منڈل کی بنیاد ڈالی۔ بٹارک منڈلکسے کہتے ہیں، اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ، بقول ہیوگل، منڈل وہ وہار ہے جس پر گول کلش لگا ہو۔ بٹارک کا مطلب سوامی اور لوکیشور کی یاد میں بنایا گیا وہار ہے جس پر گول کلش رہا ہوگا۔ یہ شاردا کتبہ تیسری بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ وہ یوں کہ بارہوں صدی یہاں بدھ دھرم اپنے عروج پر تھا۔ اس وقت اس مذہب میں فلسفے کا بہت زیادہ عمل دخل ہو گیا تھا۔

فوٹو F

کتبہ بخط شاردا سنسکرت، چشمہ کوٹھیر انت ناگ، بعہد سلطان شہاب الدین والی کشمیر سنہ ۴۵ لوکک، مطابق ۱۳۶۹ء

فوٹو G

کوٹھار

کوٹھار ضلع اننت ناگ کا ایک گاؤں ہے جہاں ایک پُرانے پُل سے شاردا کتبہ دستیاب ہوا ہے۔ یہ اب سرینگر کے میوزیم میں رکھا گیا ہے۔ اگر چہ یہ کشمیری دِوری پتھر کا ہے لیکب بہت ہی شکستہ حالت میں ہے۔ کتبے کا دایاں حصہ ٹوٹا ہوا ہے جس سے اس پر درج معلومات کو یکجا کرنا کارے دارد والا معاملہ بن گیا ہے۔ یہ کتبہ استوتی سے شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد جودھا نامی کسی خاتون کا ذکر کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ نیک خاتون اسی پُل کے گرد ونواح میں رہتی ہو اور گنیش پوجا کرتی رہی ہوگی۔ اسی وجہ سے کتبہ اسی پُل میں نصب کیا گیا ہو کہ اس نیک خاتون کی گنیش پوجا آجانے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ بن سکے۔

کتبے پر سلطان شہاب الدین کا ذکر ہے۔ اسلئے اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ یہ کتبہ سلطان شہاب الدین کے وقت کا ہے۔ شہاب الدین کی تعریف میں کتبے میں کندہ ہے کہ وہ پانڈوؤں کی اولادوں میں سے تھا۔ اس طرح کسی مسلمان کی تعریف کچھ اٹ پٹی سی لگتی ہے لیکن لکھنے والا یہ باور کرنا چاہتا ہے کہ شہاب الدین ویسا ہی بہادر اور عقلمند تھا جیسے کہ پانڈو۔

کھنموہ

کھنموہ، کشمیر کی ایک مشہور جگہ ہے۔ اس کے شمال میں بھونیشوری نام کی ایک جگہ ہے۔ اس جگہ ایک نالے کے کنارے شاردا کتبہ اس وقت بھی موجود ہے۔ کتبہ دِوری پتھر ہے۔ اس پر درج ہے کہ کھنموہ میں پُورن نام کے ایک برہمن کالی سموت نے 1530ء میں آشرم تعمیر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہ وقت ہے جب کشمیر میں سلطان زین العابدین حکومت کرتا تھا۔ اور اس وقت کھنموہ میں چھندک نامی ایک شخص مقامی افسر تھا۔ کتبے میں درج ہے کہ یہاں دو ماہرِ تعمیرات رہتے تھے۔ جن کو کنتھ اور کنتھک کہتے تھے۔ یہ شاردا کتبہ جس نے تخلیق کیا ہے اسے گگ کہتے تھے۔ کتبے کے مطابق یہاں مندر کی تعمیر 1530 کالی سموت یا دسمبر 1428ء میں ہوئی ہے۔ یہ وہی وقت ہے جب یہاں سلطان زین العابدین کا دور حکومت تھا۔ اگر چہ یہ کتبہ فی الوقت بھی دستیاب ہے لیکن جس مندر کا اس پر ذکر ہے وہ وہاں کہیں نظر نہیں آتا۔

تواریخی لحاظ سے یہ کتبہ بہت اہم ہے۔ کیونکہ اس پر جو عبارت درج کی گئی ہے وہ تاریخ کی کئی کڑیوں کو جوڑنے میں مدد کرتی ہے۔ وہ یوں کہ اس پر ستی سر، کھنموش، جے پڑکلہ اور بھونیش جیسی جگہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ستی سر کے متعلق مجھے یہاں کچھ بھی نہیں کہنا۔ کیونکہ اس کے متعلق بہت سارا لکھا گیا ہے۔ کھنموش، کشمیر کا ایک قدیم گاؤں ہے جو قدرت کے حسن سے مالا مال ہے۔ اس کا ذکر راج ترنگنی میں کھنموش کہہ کر ہی کیا گیا ہے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ کھنموش صرف کھنموہ

رہ گیا جو سری نگر کے مشرق میں 14 کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ کھنموہ مشہور سنسکرت عالم اور شاعر بلہن کی جائے پیدائش ہے جس نے خود ہی اس بات کا واشگاف اپنی مشہور سنسکرت تخلیق وکرما دیو چرت کے شلوک کے نمبر 29 میں کیا ہے۔ راج ترنگنی مین درج ہے کہ یہاں راجہ جے پیڈ نے ایک قلعہ تعمیر کرایا جسے اُس زمانے میں ابے نیتر کوٹ کہتے تھے۔ مشہور یورپی عالم بہلر جب کشمیر آیا اس وقت اس نے یہ قلعہ اندکوٹ گاؤں میں مانسبل جھیل کے کنارے دیکھا۔ شری ورا اپنی راج ترنگنی کے شلوک نمبر 540 میں اس قلعے کا ذکر کرنا نہین بھولتا۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی تک یہ قلعہ مستحکم حالت میں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کھنموہ کو کسی زمانے میں جے پیڈ پور بھی کہتے تھے۔ آخری لفظ بونیش ہے۔ جو آج کل کے بھونیشوری نام کی بگڑی شکل ہوسکتی ہے۔

کتبے میں درج ہے کہ کھنموہ کو راجہ کھینگندر نے بسایا۔ وہاں ایک آگر ہار بھی تھا جس کا ذکر کلہن نے راج ترنگنی میں کیا ہے۔ آگر ہار کا مطلب وہ جگہ، گاؤں یا جاگیر ہے جس کی آمدن سے کوئی دھرم شالہ چلائی جائے۔ پرانے زمانے میں آگر ہار کا قیام نہایت ہی کار ثواب تسلیم کیا جاتا تھا۔ قدیم تذکروں میں رقم ہے کہ پندرھویں صدی میں کھنموہ، کھگیندر نام سے ایک شہری کی صورت میں آباد تھا۔ اس کے علاوہ کتبے میں چھندک نام کے ایک برہمن کا ذکر ہے ج سکے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس وقت کھنموہ کا راج اسی کے ہاتھ میں تھا۔

محمد شاہ کی قبر کا کتبہ

ہاری پربت سرینگر شہر میں واقع ہے اور وہاں پر حضرت بہاؤالدینؒ صاحب کی مشہور زیارت ہے۔ اس زیارت کے احاطے میں کئی ایسی قبریں ہیں جن پر شاردا میں کتبے تحریر ہیں۔ کتبے میں سلطان محمد شاہ کے دور حکومت میں تختِ سلیمانؑ (موجودہ شنکر آچاریہ) کے دامن میں جنگ کا ذکر ہے جس میں ابراہیم کے فرزند سید خان کو ہلاک کیا گیا ہے۔ یہ کتبے کی عبارت تھی۔ کتبے پر تاریخ درج ہے۔

(۴۲) ۶۰ ساون کی اماوس، شکر وار مطابق ۹ جولائی ۱۴۸۴ء، یہ وہ تاریخ جب یہ جنگ ختم ہوئی۔ کتبے پر جس سید خان کا نام درج ہے یہ وہ شخص ہے جو بقول شری ور ایک بہادر اور جنگجو تھا۔ کتبہ ایک اور بات کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ یہ کہ اس وقت یہاں شاردا کے ساتھ ساتھ عربی زبان بھی مقبول عام رہی ہوگی۔ کیونکہ کتبے پر دونوں زبانوں کا استعمال کیا گیا ہے۔

خواجہ عبدالغنی کی تحقیقی کتاب 'شاردا تاریخ کے ارتقائی مراحل' سے چند اقتباسات

{یہ جگہ مقدس گوتاموں (روحانی رہبروں) کی جائے پیدائش رہی ہے۔تجوان کے ضمن میں M.A.STEIN اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 282 میں رقم طراز ہے "تجھیاں کی موجودہ آبادی کے عین متصل مجھے وہ جگہ دکھائی گئی جہاں یاتری تجوان کی مقدس رسم کی ادائیگی کے لیئے خاص قسم کی عبادت کیا کرتے تھے۔یہ وہ مقدس جگہ ہے جہاں تجھیاں کی پہاڑی ندی (تجھیاں نالہ) جنوب مشرق کی سمت کشن گنگا میں ملتی ہے"۔ [1]

[1] شاردا کے ارتقائی مراحل (خواجہ عبدالغنی)

سٹین کے مندرجہ بالا بیان سے بین السطور یہ معنی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ماضی میں تجوانے کی مقدس رسم موجودہ تجھیاں نالے اور دریائے نیلم کے سنگم پر منائی جاتی تھی۔تذکرہ نویسوں کے بقول قدیم کشمیری ہندوؤں کا عقیدہ تھا۔تجوانے کی رسم منانے سے انسان کے اپنے گناہوں کے ساتھ ساتھ اس کے ماں باپ اور عزیز و اقارب کے گناہ بھی معاف ہوجایا کرتے تھے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مقدس گوتامے یا اوتار بشمول منی سنڈالیا کی اس مقدس سرزمین پر مسکن گزیں رہے ہیں۔یہاں سے دریافت ہونے والے آثارِ قدیمہ اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ یہ جگہ فی الواقع ماضی میں بے حد مذہبی اہمیت کی حامل رہی ہے۔اس گاؤں میں جگہ جگہ آبادی کے آثار ملتے ہیں۔اسی گاؤں کی ایک ملحقہ بستی چٹون سے چند سال قبل کافی تعداد میں تانبے کے سکے دریافت ہوئے۔ان سکوں کو راقم الحروف نے پاکستان کے سب سے بڑے ماہر آثار قدیمہ احمد حسن دانی کو دکھایا۔بقول احمد حسن دانی "ان میں سے کچھ سکے پرانے ہیں۔یہ یقیناً ان 52 راجوں میں سے کسی راجے کے دور کے ہوسکتے ہیں جن کے بارے میں پنڈت کلھن کی راج ترنگنی کسی بھی قسم کی معلومات دینے سے قاصر ہے"

ان سکوں کے علاوہ تجوانے (تجھیاں) سے ملحقہ آبادی ڈھنہ کے مقام پر ایوب نامی ایک کسان کو اپنی زمین سے ایک پتھر کا بنا ہوا بہت ہی بڑا کنڈ ملا۔یہ کنڈ بناوٹ کے اعتبار سے یقیناً ایک قابل ذکر شاہکار ہے۔اس کنڈ کی بناوٹ نہایت ماہرانہ ہے۔جس شخص نے بھی اس نادر نمونے کو دیکھا وہ حیران رہ گیا۔اس کنڈ کے اوپر

پتھر کا ایک حد درجہ نفاست سے بنایا گیا ٹل یا ناوا بھی دریافت ہوا ہے اور اس بڑے کنڈ کے ساتھ قطار کی شکل میں تین پتھر اور دو لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کنڈ بھی ملے ہیں۔

تذکرہ نویسوں اور ماہرین آچار قدیمہ کا خیال ہے کہ کنڈوں کا یہ کمپلیکس بذات خود ایک مقدس مذہبی رسم کا سراغ دیتا ہے جسے عرف عام میں کنڈیوگا کہتے ہیں۔ آچار قدیمہ کے ان عجائبات کے علاوہ تجیاں گاؤں کے شمال میں دریائے نیلم سے تقریباً پانچ سے چھ سو فٹ کی بلندی پر ایک احاطہ ہے جس کی لمبائی 10 فٹ اور چوڑائی تقریباً 7 فٹ ہے۔ یہ احاطہ عرصہ قدیم سے مقدس زیارت کے نام سے مشور ہے۔ اس زیارت یا احاطے کی گردا گرد چونے کے پتھروں سے اٹھائی گئی چوکور دیوار ہے۔ دیوار کی موٹائی دو فٹ سے کچھ سے زیادہ اور احاطے کی اس دیوار کی اونچائی پانچ فٹ ہے۔ اس احاطے کے اندر کسی قبر یا تربت کے کوئی آثار نہیں۔ احاطے کے باہر کشمیری بیر کے دیو قامت درخت استادہ ہیں۔ اگر سائنسی طریقہ کار کے تحت ان درختوں کی عمر کا کھوج لگایا جائے تو ہمیں تجوانے کی عظمتِ رفتہ کے بارے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ چونکہ بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگلی بیر کے یہ درخت ایک ترتیب سے لگائے گئے ہیں۔ اور اس ہزاروں سال پرانی شجر کاری کے پیچھے انسانی ہاتھ کارفرما نظر آتا ہے۔ جہاں تک احاطی کی دیواروں کی بناوٹ کا تعلق ہے ہماری موجودہ تہذیب کے لئے محیر العقول معمہ ہے۔ چونکہ دو فٹ سے بھی کم موٹائی والی یہ دیواریں سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال سے بنا کسی مرمت کے ایک مربوط نظام کے تحت استادہ ہیں۔ اس احاطہ کا تقدس

زمانہ قدیم سے لوگوں کے دلوں میں موجود رہا ہے۔ راقم نے بذات خود اس احاطے کو دیکھا ہے۔ اور اس کے تقدس کے بارے میں اس گاؤں کے مرحوم نمبردار اقبال میر صاحب سے دریافت کیا، مرحوم نے اس بارے میں مجھے یوں کہانی سنائی تھی۔

"ہمارے جد امجد کشمیری حکمران سکندر بت شکن کی فوج میں ملازم تھے۔ سکندر کی وفات کے بعد شہزادہ شاہی خان (بڈشاہ) نے پنجاب کے علاقے جنگ سیال پر لشکر کشی۔ اس جنگ میں ہمارے جد امجد نے بہادری دکھائی اور دشمن فوجوں کو کافی نقصان پہنچایا۔ ان کے بہادرانہ کام کو دیکھ کر جنگ سیال ریاست کی شہزادی جٹ دادا جان پر عاشق ہوگئی۔ لہٰذا ہمارا دادا ہماری دادی جٹی کو لے کر کشمیر سے ہوتا ہوا یہاں آیا۔ اس نے یہ مقدس احاطہ دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اپنا رہائشی مکان بنالیا۔ تب سے اب تک یہ جگہ ہمارے لئے مقدس ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ کسی کی قبر ہے یا زیارت..... البتہ جس قسم کی مراد لے کر جاؤ پوری ہوتی ہے"۔

نمبردار مرحوم نے راقم کو ریاست کشمیر کے پٹھان گورنر کی طرف سے جاری کردہ وہ حکم نامہ بھی دکھایا جو 1811ء کا تحریر شدہ تھا اور جس میں نمبردار مرحوم کے جد امجد میر رضا محمد کو بالائی کشن گنگا کا بااختیار نمائندہ تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ تحریر فارسی میں تھی اور نہایت عمدہ کاغذ پہ لکھی گئی تھی۔

نمبردار مرحوم کی اس کہانی سے مترشح ہے کہ احاطہ موجودہ مسلمان آبادی سے پہلے کا ہے اور یہ اس طرح کے جملہ شواہد جمع کرنے کے بعد ہم یہ کہنے میں سو فیصد حق بجانب ہیں کہ ماضی کے تجوانہ میں مقدس گوتامے اسی احاطے میں قیام پذیر رہے ہیں۔ بالفرض اگر یہ کسی مسلمان صوفی کی زیارت ہوتی تو مستر

Bates ضرور اپنے تذکرے میں اس کا ذکر کرتے۔ چونکہ باقی جگہوں میں جہاں جوئی زیارت یا مندر تھا، Bates نے تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔

سراسواتی

سراسوتی یا ناردا شاردا مہادیوی کا ایک روپ ہے۔ اس روپ کا ذکر منی شنڈالیا کی کہانی میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ راج ترنگنی کی پہلی ترنگ کے اشلوک نمبر 35 میں پنڈت کلہن سراسوتی دیوی کے بارے میں لکھتا ہے ''یہاں سراسوت دیوی راج ہنس کی شکل میں جھیل میں تیرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ جھیل بھید کھڑی کی پہاڑی کے اوپر واقع ہے''۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ پنڈت کلہن نے اس اشلوک سے پہلے یعنی 28 اور 29 نمبر اشلوک میں صاف الفاظ میں شاردا دیوی کی جنم بھومی یعنی شاردا گاؤں کا حوالہ دیا ہے۔ جو بقول اس کے سندھو گنگا (نیلم دریا) اور مدھومتی ندی (شاردا نالا) کے کنارے واقع ہے۔

یہ جملہ تاریخی حوالہ جات کل ملا کر ہمارے سامنے سراسوتی یا ناردا دیوی کی مجسم شکل ہو بہو وہی شکل بتاتے ہیں جو شاردا دیوی کی ہے۔ ناردا یا سراسوتی پر بحث چھڑنے سے قبل میں اس لوک کہانی کو یہاں نقل کرنا ضروری خیال کرتا ہوں جو صدیوں سے اس دیس کے لوگ سناتے آئے ہیں۔ ڈاکٹر خرم قادر نے اپنے تحقیقی مقالہ میں اس کہانی کو شامل کیا ہے اور Stein نے بھی اس کو اہمیت دی ہے''۔

کہانی کچھ اس طرح سے شروع ہوتی ہے کہ ''ناردا اور شاردا جڑواں بہنیں

تھیں۔ ناردا شاردا کے عین متصل پہاڑی پر جا بسی۔ جبکہ شاردا موجودہ مندر ہی کی جگہ مسکن گزین ہوئی۔ وقت گزرتا گیا اور یہ دونوں بہنیں ایک دوسری کی ہمسائیگی میں خوش و خرم زندگی بسر کرتی رہیں۔ دنیا کا نظام چلانے والے تمام دیو اور جنات ان کے غلام بن گئے۔ پھر زمانے نے کروٹ بدلی۔ ایک دن جب ناردا اپنے بلند پہاڑی گھر سے نیچے اپنی بہن کے مسکن کو دیکھنے لگی، تو اسے یہ دیکھ کر شدید صدمہ ہوا کہ اس کی بہن شاردا مر چکی ہے اور تمام دیوتا لاش کو بے گور و کفن چھوڑ کر غائب ہو چکے ہیں۔ اس پر ناردا نے سراسوتی کے روپ میں اپنی بہن کی میت پر ماتم کیا۔ تمام دیوتاؤں کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور ہدایت کی کہ وہ تمام مقدس پتھر جو ناردا کے ذاتی محل کے لئے تیار کئے گئے ہیں، وہاں سے اٹھا کر شاردا دیوی کے مسکن تک لائے جائیں۔ پس ناردا دیوی نے اپنے ہاتھوں سے شاردا دیوی کو دفن کیا اور ان پتھروں سے زیارت کے گرد ایک احاطہ تعمیر کروایا جسے شاردا تیرتھ کہتے ہیں''۔

یہ کہانی کتنی حقیقت اور کتنی Fiction ہے ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ یہ بات تحقیقی جائزوں کے بعد سو فیصد درست ثابت ہوئی ہے کہ جو تعمیراتی پتھر شاردا مندر کے احاطے میں استعمال ہوئے ہیں، ناردا پہاڑی میں موجود سراسوتی جھیل کے گرد و نواح سے کم از کم 15 ہزار فٹ کی بلندی سے کسی نہ سمجھ آنے والی تکنیک کے ذریعے نیچے دریائے نیلم کے مغربی کنارے تک لائے گئے ہیں۔ یہاں سے یہ پتھر کسی نہ سمجھ آنے والی ترکیب کے ذریعے دریائے نیلم کے مشرقی کنارے تک پہنچائے گئے ہیں اور وہاں سے شاردا مندر تک لائے گئے ہیں۔ فن تعمیر کا یہ انوکھا انداز جدید دور کی سول انجینئرنگ کے طریقہ کار سے

قطعی مختلف بلکہ ان کے لئے نہ سمجھ آنے الا معاملہ ہے۔

تذکرہ نویس اس غیر معمولی کام کی تکنیک کے نہ سمجھ آنے کو نسلی خلا یا Generation Gap کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر خرم قادر.......

''شاردا مندر میں استعمال ہونے والے پتھروں کو ہم اس لئے جنوں اور دیوؤں کا کام قرار دیتے ہیں کہ نسلی خلا کی وجہ سے ان لوگوں کی مہارت یا تکنیک ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ اس لئے ہر وہ چیز جس کی انسان کو سمجھ نہیں آئی اس کو جنوں اور دیوتاؤں سے منسوب کرنا ایک نہایت ہی آسان طریقہ ہے۔ نارداکی بلند پہاڑی سے ان بھاری بھرکم پتھروں کو کم از کم دو دن کی پیدل اور دشوار گزار مسافت طے کرکے نیچے لانا۔ پھر ان کی تراش خراش اور دریا کی دوسری طرف لے جاکر مندر میں استعمال کرنا یقیناً ایک حد درجہ تکلیف دہ کام ہے اور ایسا کام مذہبی عقیدہ کے بغیر ممکن نہیں''۔

یہاں ایک اہم سوال قارئین کے ذہن میں ابھر سکتا ہے یعنی وہ کون سے یقینی حالات ہیں جن کو مدنظر رکھ کر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ شاردا تیرتھ کے احاطے میں استعامال ہونے والا پتھر واقعی نارداپہاڑی سے اتارا گیا ہے۔ اس بارے میں بذیل ٹھوس شواہد موجود ہیں۔

1۔ 15ہزار فٹ کی بلندی پر موجود سراسوتی جھیل کے نیچے ایک نہ سمجھ آنے والی ترکیب کے ذریعے کو تعمیراتی پتھر فرش کی شکل میں بچھایا گیا ہے جسامت، حجم اور کوالٹی کے اعتبار سے یہی پتھر شاردا تیرتھ میں استعمال ہوا ہے۔

2۔ سراسوتی جھیل کے مشرقی کنارے پر یاتریوں کے لئے جو گھاٹ بنایا گیا

ہے اس میں بھی تعمیراتی ترکیب اور پتھروں کا استعمال شاردا مندر سے سوفیصد مماثلت رکھتا ہے۔

3۔ قادر نے بچشم خود اور بے شمار دیگر لوگوں نے نارداپہاڑی کے ایک مقام پر کم از کم تین ایسے تراشیدہ پتھر دیکھے ہیں جن کو معماروں نے تراش کر شاردا تیرتھ کے لئے تیار کر کے رکھا ہے لیکن نامعلوم وجہ کی بنا پر یہ تیار شدہ پتھر منزل مقصود تک نہ پہنچائے جاسکے۔

4۔ نارداپہاڑی کے اوپر ڈاکٹر محسن شکیل نے جو Image دریافت کیا ہے وہ شاردادیوی کا سراسوتی روپ ہے۔ اس روپ میں دیوی جی ایک دوشیزہ عورت کے روپ میں سراسوتی جھیل سے تقریباً چار سو فٹ کی بلندی پر لیٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ سراسوتی کا یہ روپ آن لائن دستیاب ہے۔

جہاں تک نارداکے اس سراسوتی روپ سمیت شاردا تیرتھ میں استعمال شدہ پتھروں کا نارداکی بلند پہاڑی سے نیچے لانے کا سوال ہے تو اس بارے میں نہ تو شاردا مہاتمایا ہماری کچھ رہنمائی کرتی ہے اور نہ ہی اس موضوع پر فاضل مورخین بشمول M.A.Stein ہماری مدد کرتے نظر آتے ہیں۔ بریگیڈئر رتن کول Abode of godess Sharda میں اس موضوع پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

''جہاں تک نارد ایا سراسوتی کا شاردا مندر کی تعمیرات کے ساتھ تعلق ہے ہمیں سینہ بہ سینہ روایات پر ہی اکتفاء کرنا پڑے گا چونکہ اس باب میں زیادہ تر حقائق تحریری ریکارڈ نہ ہونے کی وجہ سے دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہی رہیں گے۔ اس

کے علاوہ بھی چند دیگر وجوہات ہیں جو بالترتیب ملاحظہ کی جاسکتی ہیں‘‘۔

۱۔ نارد یا سراسوتی شاردا کا ایک علیحدہ روپ ہے یہ روپ علیحدہ نام کے طور پر شاردا کی جگہ استعمال ہوا ہے۔شاردا کی تعریف میں جو بھجن، وندنا یا مناجات سینہ بہ سینہ ہم تک منتقل ہوئے ہیں ان میں شاردا، دارداد یوی، شاردا وندنا اور شاردا دیشہ یا شاردا منڈالا جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ان تعریفی مناجات میں نارد یا سراسوتی کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا۔صرف منی ژنڈالیا کے بھجن میں شاردا کے دوسرے بڑے روپ کے طور پر نارد یا سراس وتی کا ذکر ملتا ہے جو تاریخی شہادت کے زمرے میں بہت ناکافی ہے۔

۲۔ جہاں تک شاردا مندر کے اصل سن تعمیر کا تعلق ہے آج تک کوئی بھی تاریخ دان ایسا عرصہ دریافت نہ کرسکا جو شاردا تیرتھ کی تعمیر کے بارہ میں درست تاریخ فراہم کرسکے۔مؤرخ، ماہر آثار قدیمہ یا عمرانیات تیقن کے ساتھ یہ نہیں بتا سکتا کہ کس بادشاہ، راجے یا سردار نے کس سن میں شاردا مندر تعمیر کیا اور کیوں؟ مندر کی تعمیر سے متعلق محیرالعقول کام آج ہمارے لئے جتنا پُر اسرار معمہ ہے آج سینکڑوں سال قبل پنڈت کلہن کے لئے بھی اسی قدر پُر اسرار اور لاینحل معمہ رہا ہوگا۔معلوم ہوتا ہے کہ کلہن کے دور سے قبل کشمیر کی غیر یقینی جغرافیائی صورت حال کے پیش نظر آبادیوں کے اجڑنے اور دوبارہ آباد ہونے کی وجہ سے نسلی گیپ پیدا ہوگئے۔جن کی وجہ سے نارداسمیت کئی دیگر مقامات کی تاریخی حیثیت کے جملہ ثبوت آنے والی دنیا کے لئے پوشیدہ رہ گئے ہیں۔

۳۔ کشمیر کے اندر پوجا پاٹ کی تمام عبادت گاہوں کو پیر پنچال، شمس ہری

اور ہمالیہ کے دامنی پہاڑی سلسلوں نے گھیر رکھا ہے۔انہی پہاڑوں کے دامن میں، گنگا بل، امرناتھ، اور شاردا واقع ہیں۔کوئی بھی ایسی مقدس جگہ نہیں جو ان پہاڑی سلسلوں کے باہر واقع ہو۔اس کی بڑی وجہ کشمیر کی 98 فیصد آبادی کا ان وادیوں کے دامن میں آباد ہونا ہے۔اس لئے نارد یا سراسوتی براہ راست 12 سے 16 ہزار فٹ کی بلندی پر واقع مقام ہونے کی وجہ سے عوامی پہنچ سے دور ہے اور اس طرح گمنامی میں چلے گئے۔

ہمارے لئے ایک بنیادی مسئلہ جو تحقیق طلب ہے کہ جب Stein نے 1892ء کے موسم بہار میں درہ شیتل وان کے راستے شاردا تیرتھ کی سیر کی تو اس نے سراسوتی جھیل اور نارداکی مقدس پہاڑی کا ذکر کیوں نہیں کیا حالانکہ ہندوؤں یاتری اس کی شاردا یاترا کے کافی بعد یعنی 1947ء تک یہاں آتے رہے اور شاردا تیرتھ کے عین شمال میں نارداپہاڑی پر جانے کے مخصوص راستے سے ہوکر سراسوتی جھیل تک پہنچتے رہے۔بھاوانی کول نامی عالمی شہرت یافتہ مصنف اور مؤرخ.... جس نے اکبر اعظم کے دور کے جملہ تاریخی واقعات ریکارڈ کئے ہیں۔اٹھارویں صدی کے وسط میں شاردا یاترا کے دوران سراسوتی جھیل تک پہنچا ہے جس کا تذکرہ موصوف کی تحریر میں موجود ہے۔یہی نہیں بلکہ انیسویں صدی کے وسط میں ہندی مذہب کا احیاء کرنے والا ویدفلاسفی پر پکا یقین رکھنے والا پنڈت راجو بھی سراسوتی جھیل کے مقدس مقام تک پہنچا ہے اور واپسی پر شاردا سے چند کلومیٹر شمال میں ایک گھاٹی عبور کرتے ہوئے یہ عظیم فلسفی برف کے تودے کی نذر ہوکر جان سے ہو تھا دھو بیٹھا۔

یہ تمام واقعات اپنی جملہ تاریخی صداقتوں کے ساتھ ہمارے پاس موجود ہیں لیکن قابل حیرت بات ہے Stein جیسے محقق اور محنتی مؤرخ کا یہاں پہنچنے کے باوجود ناردا یا سراسوتی کا ذکر نہ کرنا ہے۔ جس کی صرف دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔

ا۔ یہ کہ فاضل مصنف بدیشی ہونے کے ناطے یہاں کے جملہ مقامات سے ناواقف تھا۔ یہ ان میسر معلومات پر یقین کرتا تھا جو یہاں کے پنڈت اسے بہم پہنچاتے تھے۔ ممکن ہے کہ Stein نے وادیٔ کشمیر سے جس پنڈت کو بطور گائیڈ اپنے ساتھ شاردا لایا تھا وہ پنڈت بذات خود ناردا یا سراسوتی جھیل کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو۔ یا ناردا پہاڑی کی دشوار گزار صورت حال کے پیش نظر ان پنڈتوں نے Stein کو جان بوجھ کر حقائق سے بے خبر رکھا ہو۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ Stein نے شاردا پہنچنے کے فوراً بعد اپنی ساری توجہ شاردا تیرتھ اور سری سہلا قلعے کی جائے وقوعہ پر مرکوز کی۔ اس کو شمالی پہاڑی سلسلے کو دیکھنے یا غور کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ جیسا کہ اس تحریر سے ثابت ہے کہ بقول اس کے شاردا یا کشن گنگا وادی کی بناوٹ ہی ایسی ہے جس میں سراسوتی سمیت کسی قسم کی جھیل کا ہونا بعید از حقیقت ہے۔ حالانکہ ہر پربت جھیل، سراس وتی اور رتی جھیل بالائی کشن گنگا کی خوبصورت ترین تاریخی جھیلیں ہیں۔

۲۔ ان وجوہات کے علاوہ ایک اور وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے۔ Stein نے اپنی کتاب کی جلد دوم کے صفحہ 273 پر ''بھیدا گھڑی'' کے عنوان سے ایک لمبا چوڑا مضمون قلمبند کیا ہے۔ اپنے اس تحقیقی کام میں فاضل مؤرخ نے گنگود بھیدا مہاتمایا میں موجود تفصیل لکھنے کے بعد سراس وتی جھیل اور بھیدا پہاڑی کو شاردا کے ملحقہ

مضافات میں دریافت کرنے کے بجائے شوپیاں کے گردونوح میں کسی جگہ دریافت کیا ہے۔ اگر مصنف شاردا سے ملحقہ ناردا اور سراسوتی جھیل کو اپنے مضمون میں سموتا تو یقیناً ایک گہرا تاریخی تضاد پیدا ہوجاتا۔ پس تاریخی تضاد سے بچنے کے لئے سٹین نے ناردا اور سراسوتی جھیل کا تذکرہ نہیں کیا ہوگا۔ ان جملہ تردیدی یا تائیدی بیانات کے بعد ہم ضروری خیال کرتے ہیں کہ ناردا کے ضمن میں اس سراسوتی جھیل کا بھی تذکرہ ہوجائے۔

سٹین کا یہ بیان کہ کشن گنگا وادی میں شاردا کے نزدیک کسی بھی قسم کی سراسوتی جھیل کا ہونا ناممکن بات ہے۔ خالصتاً ایک تحقیقی غلط فہمی ہے جو بدیشی ہونے کے ناطے موصوف کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہے۔ جو شخص وادی نیلم کے حدود اربعہ سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ شاردا کے مضافات میں ایک نہیں تین تاریخی جھیلیں ہیں۔

1۔ سراس وتی جھیل جو شاردا کے شمال میں ناردا پہاڑی پر واقع ہے۔

2۔ رتی گلی جھیل جو شاردا کے عین مغرب میں ڈیڑھ دن کی مسافت پر تھانیاں اور دواریاں کے بلند پہاڑی سلسلے کے اوپر واقع ہے۔

3۔ ہری پربت جھیل جسے عرف عام میں چٹا کٹھا جھیل کہتے ہیں۔ یہ کشمیر کے انتہائی بلند پہاڑی سلسلے پر پائی جانے والی سب سے بڑی قدرتی جھیل ہے۔ شاردا سے تقریباً دو دن کی پیدل مسافت پر وادیٔ کیل کی ایک ذیلی وادی شونٹھر میں ہری پربت تاریخی پہاڑ کے دامن میں اپنی قدرتی خوبصورتی کو جوہر دکھا رہی ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہی شونٹھر وادی ہے جس میں روبی جیسے قیمتی پتھروں کی کان ہے جس

ت	त	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
تھ	थ	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
د	द	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
دھ	ध	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ن	न	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
پ	प	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
پھ	फ	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ب	ब	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
بھ	भ	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
م	म	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ے	य	-	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ر	र	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ل	ल	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
و	व	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ش	[illegible]	-	[illegible]	-	[illegible]	[illegible]
کھ	[illegible]	-	[illegible]	-	[illegible]	[illegible]
س	स	-	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ح	ह	JIII	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
	[illegible]	-	-	-	-	[illegible]
	[illegible]	-	-	-	-	[illegible]
	[illegible]	-	-	-	-	
ڑ	-	-	-	[illegible]	-	[illegible]

COPIED FROM "GURMKHI LIPPI DA JANAM TE VIKAS (Table o and L) by Late Sardar G.B SINGH (PUNJAB UNIVERSI-

سے حکومت آزاد کشمیر سالانہ کروڑوں روپے کی سرمایہ کاری کرتی ہے۔

یہاں یہ تاریخی غلطی یا ابہام دور کرنا انتہائی ضروری ہے کہ سرینگر کے نزدیک جس پہاڑی کو ہری پربت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کے اوپر ہری پربت کا قلعہ بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ دراصل اسے اصل ہرری پربت کے متبادل کے طور پر مقدس مانا جاتا رہا ہے۔ جس کی صاف وجہ یہ ہے کہ شونٹھر وادی کے بلند ترین پہاڑی سلسلوں میں سے ہری پربت Peak سب سے اونچی پہاڑی چوٹی ہے۔ جس تک آسانی سے پہنچنا از حد مشکل ہے۔ اس لئے جس طرح ''گوشی'' کو شاردا کے متبادل ے طور پر لیا جاتا رہا اسی طرح اصل ہری پربت کے بدلے سرینگر میں کسی پہاڑی چٹان کو ہری پربت کے متبادل کے طور پر منتخب کیا گیا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ بدھوں کے زوال کے بعد شاردا پیٹھ کو مندروں میں تبدیل کیا گیا۔ یہ بھی ذکر ملتا ہے کہ بارھویں صدی عیسوی تک وہاں ایک بڑی لائبریری تھی۔ اسی صدی میں راجہ جے سنگھ والی گجرات نے عظیم جین عالم کو گرامر تیار کرنے کے لئے شاردا مندر کشمیر میں بھیجا تھا۔ کیونکہ وہاں کا کتب کا نہ بڑا مشہور تھا۔ ظاہر ہے کہ اس لائبریری میں سنسکرت اور دوسری زبانوں کی کتابوں سے زیادہ ذخیرہ پہاڑی زبان کی ادبیات کا ہوگا جو زماہ کی دست برد کے ہاتھوں نابود ہوگیا۔}

ا آ ب پ ت ٹ ث

ج چ ح خ

د ڈ ذ ر ڑ ز ژ

س ش ص ض

ط ظ ع غ ف ق

ک گ ل م ن ں ٹ

و ہ ھ ء

ی ے

pha.	da.	[illegible]	[illegible]
ba.	dha.	ḍa.	[illegible]
bha.	ṇa.	ja.	[illegible]
ma.	ta.	[illegible]	[illegible]
ya.	tha.	ka.	[illegible]
ra.	da.	kha.	[illegible]
la.	dha.	ga.	ka.
va.	na.	ja.	kha.
	pa.	tha.	ga.